مضامین سود مند

گزارش

رسالہ سود مند جون ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا مئی ۱۹۲۶ء
میں علی گڑھ سے منتقل ہو کر بدایوں آ گیا مئی ۱۹۳۳ء تک رسالہ کی حیثیت
میں بدایوں سے نکلتا رہا اس نے رسالہ زندگی میں اس نے اپنے مقصد
کی تکمیل میں جیسی ہونی چاہئے کامیابی حاصل کی اس کا مقصد زندگی یہ تھا
کہ مسلمانوں کی مالی حالت جو روز بروز گرتی چلی جاتی ہے درست کی جائے
اور ان کو تجارتی سود اور ربا کا جو قطعی حرام ہے فرق بتایا جائے تفصیل یہ ہے۔
صاحب بانی رسالہ نے جون ۱۹۲۵ء کے پرچہ میں سود مند کے جاری
کرنے کی ضرورت پر جو مضمون لکھا تھا اس کو ہم نے اس مجموعہ میں سب سے پہلے
درج کر دیا ہے ناظرین ملاحظہ کریں گے رسالہ کے مضامین نے ۱۹۳۱ء
میں اس تحریک کا چرچا پیدا کر دیا اور یہی اس کے اجرا کا مقصد تھا۔
سید صاحب نے اس پرچہ کے مضمون میں خود ہی لکھ دیا تھا کہ چند سال میں جب
قوم میں ان امور کا چرچا ہو جائے گا تب اس رسالہ کا کام ختم ہو جائے گا
چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ۱۹۳۳ء میں اس رسالہ کی جگہ کی اشاعت ختم
ہو گئی اور جنوری ۱۹۳۴ء سے بدایوں کے ہفتہ وار اخبار ذوالقرنین میں

مدغم ہو گیا جس میں ہر ہفتہ سود منار کالم کے عنوان کے تحت میں اس مقصد کی سعی جاری رہتی ہے۔ سود منار کے بند ہونے کے بعد گزشتہ تین سال میں اس کی پرانی جلدوں کی مانگ برابر جاری رہی کیونکہ مکمل جلدوں کی کافی تعداد گزشتہ سالوں کی بابت موجود نہ تھی اس لیے ہر فرمائش کی تعمیل نہ ہو سکتی تھی کارکنان نظامی پریس نے شائقین کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیئے یہ مناسب سمجھا کہ سود منار کے اہم مضامین کا انتخاب ایک مجموعہ کی صورت میں شایع کیا جائے۔ چونکہ ایسے مضامین کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ وہ سب کے سب ایک وقت میں شایع نہ ہو سکتے تھے اس لیئے فی الحال یہ مجموعہ قسط اول کی صورت میں شایع کیا جاتا ہے۔ اُمید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں گے اور اس تحریک کو جو ۱۹۲۵ء میں جاری ہوئی تھی تقویت پہونچے گی

محمد احمد الدین

پرنٹر و پبلشر

نظامی پریس بدایوں

اکتوبر ۱۹۳۶ء

سنہ ۱۹۲۵ء

(۱)

اجرا ر سود مند

میں چالیس سال سے مسلمانوں کی قومی ترقی کی تحریکات کو دیکھ رہا ہوں۔ بچپن میں سنتا تھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چونکہ سلطنت نکل گئی اس لیئے وہ برباد ہو رہے ہیں۔ انھوں نے چونکہ اہل یورپ کے علوم و فنون سیکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اس لیئے وہ سرکاری عہدوں سے خارج ہو رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ تجویز کیا گیا کہ مسلمان انگریزی زبان اور جدید علوم حاصل کریں چنانچہ انھوں نے اس طرف توجہ کی اور انگریزی پڑھ کر ایسے ایسے بڑے عہدوں پر پہونچے کہ جن کا چالیس سال قبل تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ باوجود اس کے یہ سب کو محسوس ہو رہا ہے کہ وہ روز بروز قعر مذلت میں گرتے چلے جا رہے ہیں اور اب یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے کہ قومی جسم کے اعضا علیحدہ ہو کر دیگر مذاہب میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔ اور تعلیم جس کو جملہ امراض کے لیئے اکسیر سمجھ رکھا تھا اب وہ بھی بوجہ گرانی کے اُن کی دسترس سے باہر ہوتی جاتی ہے اب رہی صنعت و حرفت اور تجارت ان میں مسلمانوں کی تعداد کم نہیں

مگر بوجہ اس کے کہ وہ دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کا روپیہ استعمال کرتے ہیں، اُن کی محنت کے پھل کا گودا روپیہ والوں کے ہاتھوں میں جاتا ہے اور اُن کے پاس صرف چھلکا بچتا ہے جس کی وجہ سے وہ بے اطمینانی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ زندگی کے معمولی واقعات مسلمان پیشہ وروں کے لیے سخت حادثات ثابت ہوتے ہیں اور حتیٰ روزہ بیماری یا بیکاری اُنھیں گداگری کے درجہ پر پہونچا دیتی ہے۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ صاحب جائداد اور زمیندار ہیں اُن کے تنزل کی رفتار سب جماعتوں سے زیادہ ہے مگر سب سے بڑھ کر جس امر نے مجھے متاثر کیا وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں باوجود تعلیمی اشاعت کے لیے کانفرنسیں اور جلسے منعقد کرنے کے تعلیمی تنزل مسلسل جاری ہے اور باوجود اصلاح تمدن اور کفایت شعاری کی انجمنیں قایم کرنے اور علماء کرام کے پند و نصائح کے اسراف و افلاس میں اضافہ ہے اور دیگر اقوام میں باوجودیکہ اب سے چند سال پیشتر تبلیغی تنظیمی اور تعلیمی انجمنیں اور سبھائیں برائے نام تھیں تاہم اُن کا درجہ تعلیم و تمول اور کفایت شعاری میں مسلمانوں کی نسبت سے بہت بڑھا ہوا ہے۔

عرصہ دراز کے غور و خوض کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس زمانہ میں ایک جادو بھری چیز سرمایہ کے نام سے پیدا ہو گئی جو اس وقت دُنیا میں سب سے بڑی قوت ہے سرمایہ کا انحصار تجارتی سود پر ہے جو اگرچہ ربوا سے بالکل مختلف ہے تاہم مسلمان ربو سمجھ کر اُس سے بچتے ہیں۔ مگر کلیتاً اُس سے بچا رہنا انسانی امکان سے باہر ہے اس لیے سود لینے سے بچتے اور بچ سکتے ہیں مگر دینے سے

کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ نتیجہ یہ کہ وہ ہر شعبۂ زندگی سے خارج ہوئے ہیں۔
جب مجھے یہ یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کی بربادی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ
وہ تجارتی سود لینے سے بچتے ہیں تو اس مسئلہ کی میں نے تحقیقات شروع کی۔
علمائے کرام سے رجوع کیا۔ کتابیں پڑھیں، پرانے اخبارات کے فائل دیکھے
جس سے مجھے یہ پتہ چلا کہ اس وقت سے سو برس پیشتر حضرت شاہ عبدالعزیز
صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے غیر مسلموں سے نہ صرف تجارتی سود
بلکہ ربوا لینے کا فتوےٰ دیا۔ اس کے بعد مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے
سرکاری پرامیسری نوٹوں کا سود لینے کے جواز کا فتوےٰ دیا۔ پھر ۱۸۹۸ء
کے قریب مولوی محمد حسن صاحب متوطن بھین ضلع جہلم نے اپنی کتاب
"روض الربوا فی حقیقۃ الربوا" میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی۔ اس کے صفحہ
۸۸ پر تحریر ہے کہ

"مولانا مولوی غلام دستگیر صاحب قصوری علیہ الرحمۃ
کی کتاب "تفریع ابحاث" میں ہندوستان میں غیر مسلموں
سے سود لینے کے جواز پر لاہور، فیروزپور، ڈیرہ اسمٰعیل خاں
رامپور، بھاولپور، مکہ مکرمہ وغیرہ کے ۶۹ مفتیان فاضلان
اسلام کی مواہیر ثبت ہیں۔"

اس تحریر سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں یہ بحث اس حد تک پہنچ چکی
تھی کہ اس پر ۶۹ مفتی علما کے فتوے ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں مولوی انشاء اللہ خاں
صاحب نے اخبار وطن میں اس بحث کو چھیڑ کر جملہ مضامین ایک سالہ کی

شکل میں شایع کیے اور اس کا نام "مسئلہ سود اور تجارت قومی" رکھا اور مولوی محمد بشیر الدین صاحب نے البشیر میں مضامین کا ایک سلسلہ نکالا جس میں ثابت کیا کہ بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے مسلمان تاجر غیر مسلم ساہوکاروں کا روپیہ استعمال کرتے ہیں جس سے اصلی نفع سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے اور مسلمان مثل مزدوروں کے کام کرتے ہیں۔

ان واقعات سے میں نے نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کو مختلف اوقات میں اس مسئلہ کی اہمیت کا احساس ہوتا رہا۔ علماء کرام کے فتوے ہوئے کچھ دنوں اس کا چرچا رہا۔ پھر لوگ اسے بھول بھال گئے اور چونکہ عملی طور پر کبھی یہ کام جاری نہیں ہوا اس لیے مسلمان برابر گرتے چلے گئے۔ اس حالت میں متاثر ہو کر میں نے ۱۹۲۰ء میں خدا کے نام پر اس مسئلہ کی تبلیغ شروع کر دی اور متعدد کتابیں کثیر تعداد میں شایع کیں جن کے نام یہ ہیں:-

(۱) مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل

(۲) سرمایہ داروں کی غلامی اور مسلمان

(۳) جواز سود

(۴) مسلمانوں کی مالی اصلاح

(۵) جواز سود مع فتاوے

اسی کے ساتھ اخبارات میں مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا اور میں نہایت شکر گزار ہوں قومی اخبارات کا کہ انھوں نے اس مسئلہ کی اشاعت میں بے حد مدد کی اور انھیں کی بدولت لاکھوں مسلمانوں تک یہ

آواز پہونچی اور نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں بلکہ جزائر بحر ہند اور
اُن مقامات میں جہاں اسلامی اخبارات جاتے ہیں اس مضمون کا چرچا
ہوگیا اور رسالہ جات سود کی طلبی میں ہزاروں خطوط کی آمد کا سلسلہ قایم
ہوگیا۔ اور نہ صرف خطوط کی آمد تک یہ کام محدود رہا بلکہ مختلف مقامات میں
مسلمانوں میں روپیہ کا کاروبار جاری ہونے لگا۔ چنانچہ علاوہ انجمنہائے امداد
باہمی قایم ہونے کے لاہور میں وسیع پیمانہ پر کریسنٹ بنک قایم ہورہا ہے جس کا
سرمایہ پچاس لاکھ قرار پایا ہے۔ اور لاہور کے مسلم بنک کا سرمایہ ڈھائی لاکھ
سے دس لاکھ تک بڑھایا جارہا ہے۔ اب اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مختلف
مقامات میں افلاس سے نکلنے کے جو طریقے اختیار کیئے جائیں اُن سے ہر مقام کے
مسلمانوں کو آگاہی اور رہنمائی ہو اس کے لیئے عام طور پر تقاضا ہوا کہ ایک
موقت الشیوع رسالہ جاری کیا جائے۔ مسئلہ سود کی اشاعت کا کام جہاں
تک میرے امکان میں تھا میں ذاتی طور پر کرتا رہا مگر اب وہ منزل آگئی
کہ مسلمانوں کو سرمایہ داروں کی غلامی سے آزادی دلانے کا کام زیادہ
وسیع پیمانہ پر کیا جائے۔ خوش قسمتی سے چند اصحاب کی ایک کمیٹی اس
امر پر آمادہ ہوگئی کہ وہ مسلمانوں کی یہ بڑی ضرورت پوری کرے چنانچہ
اس کی طرف سے رسالہ "سود مند" جاری کیا جارہا ہے۔ صاف ظاہر ہے
کہ اس کا اجرا روپیہ پیدا کرنے کے لیئے نہیں کیا جاتا بلکہ غرض اصلی یہی
ہے کہ قوم کو اپنی مالی حالت درست کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے
چند سال میں جب قوم میں ان امور کا چرچا ہو جائے گا۔ اور زبان

قابل اصحاب اور قوم کے اعلیٰ پایہ کے اخبارات اس کام کو اپنے قابل
ہاتھوں میں لے لیں گے تب اس رسالہ کا کام ختم ہو جائے گا۔ پس اُن
بزرگوں اور اہل قلم اصحاب اور ایڈیٹران اخبارات اور علماء کرام کی
خدمت میں جن کے قبضہ میں قوم کی باگ ہے۔ عرض ہے کہ وہ اس اہم مسئلہ
کو جلد سے جلد اپنے قابل ہاتھوں میں لیں اور اپنے اپنے زیر اثر
مسلمانوں کو کفایت شعاری اور روپیہ بچانے اور بڑھانے کے طریقوں
سے آگاہ کر کے قوم کے اعلیٰ وادنیٰ افراد کو حقیقی معنوں میں افراد کا سبب
بنائیں جس سے مجموعی طور پر کل قوم ایک عزت کی زندگی بسر کرنے کے
قابل بن جائے۔ (جون ۱۹۲۵ء)

(۲)
علمائے کرام کی خدمت میں عرضداشت

مسئلہ سود کے بارہ میں متفقہ فتویٰ کی ضرورت

(یہ وہ تحریر ہے کہ جو حسب فرمایش جناب مولانا مولوی محمد سعید
صاحب ناظم جمعیۃ العلماء ہند مرتب کر کے جناب موصوف
کی وساطت سے اراکین جمیعۃ العلماء کی خدمت میں بھیجی
گئی تھی)

چونکہ میں سالہا سال سے مسئلہ سود کے متعلق مضامین اور رسائل
شایع کر رہا ہوں مجھ سے سوال ہو سکتا ہے کہ اب آپ نے علمائے کرام کی

خدمت میں پیش کرنے کا کیا موقع ہے اس لیئے میں اس امر کو واضح کرنا ضروری
سمجھتا ہوں کہ جب سے میرے ذہن میں مسئلہ سود کی تحقیق اور اُس کی
اشاعت کا خیال پیدا ہوا میں فرداً فرداً اپنی قوم کے مذہبی پیشواؤں کی
خدمت میں حاضر ہوا اور صدہا رسائل مطبوعہ سوالات، استفتے ان کی خدمت
میں بھیجے اور اُن کی ہمدردی حاصل کی اور جو کچھ کیا وہ علماء کرام کے
انفرادی فتوؤں کی بنا پر کیا۔ مگر مسلمانوں میں روپیہ کے کاروبار کو وسیع پیمانہ پر
کرنے کے لیئے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ علماء کرام کا ایک متفقہ
فتویٰ حاصل ہو جس کا اثر قوم پر عنداللہ پڑے۔ اس غرض سے میں سالانہ
جلسہ جمعیت العلماء ہند مرادآباد اور جلسہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاضر ہوا
اور جناب ناظم صاحب جلسہ اہل سنت وجماعت مرادآباد کی خدمت میں
عریضہ لکھا کہ مجھے جلسہ میں مسئلہ سود پیش کرنے کا موقع ملے مگر چونکہ اس قسم
کے جلسوں میں ایک یا چند اصحاب کو کامل اختیارات نہیں ہوتے بلکہ بعض
مسائل کی نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے عام جذبات کے خلاف
ہونے کی وجہ سے کثرت رائے سے فیصلہ بھی صادر نہیں کیا جا سکتا
اس لیئے مجھے مذکورہ بالا جلسوں میں عرض کرنے کا وقت نہ دیا جا سکا۔
اب جبکہ مولانا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء نے اس امر کو منظور فرمایا
ہے کہ موصوف کی وساطت سے بذریعہ تحریر کے علماء جمعیت کی خدمت
میں عرض کروں میں اپنے معروضات کو طبع کرا کر جمعیۃ مذکور اور جملہ دیگر علماء ہند
کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

البتہ اس سلسلہ میں اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت قوم کے مریض جسم میں جس خلط کی معتد بہ کمی ہے وہ سرمایہ ہے۔ قوم اس وقت اس منزل میں ہے کہ اسے کوئی تحریک بجز اقتصادی حالت کی ترقی کی تحریک کے ہرگز نہیں بھا سکتی۔ اور موجودہ کشمکش کے زمانے میں قوم جس چیز کی طرف طبعًا راغب ہے وہ صرف ذرائع معاش اور زندگی کے دن پورے کرنے کے وسائل ہیں۔ اس لیئے میں صاف طور پر عرض کروں گا کہ ہمارے مقدس پیشوایان دین جو ہدایت کرنے کے سب سے زیادہ اہل ہیں اگر مذہب کے تحت میں قوم کی اس بارہ میں رہنمائی کریں تو کوئی تحریک اس سے زیادہ مقبول اور حقیقی معنوں میں قوم کے حق میں مفید ثابت نہ ہوگی۔ جو خطوط ہزاروں کی تعداد میں اکناف ہند اور ملحقہ جزائر سے آتے رہتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام قوم اقتصادی تحریک کی بھوکی اور اس کی منتظر بیٹھی ہے۔ پس قوم کے قابل ذی علم اور قدرتی رہنماؤں کے لیئے بہترین موقع ہے کہ وہ اس میدان میں قدم رکھ کر اور غریب و ضرورت مند مسلمانوں کی رہبری کر کے انھیں اس ملک میں اور نہ صرف اس ملک میں بلکہ روئے زمین پر رہنے کے قابل بنائیں۔ میں تو بار بار عرض کر چکا ہوں کہ میں اس کام کی تبلیغ اُس وقت تک کر رہا ہوں جب تک کہ اس کام کے اہل اور قابل اصحاب اس کی طرف توجہ کریں اور اپنے کام کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بطریق احسن انجام دیں۔ اس قدر تمہید کے بعد اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

۱۔ ذرائع معاش مسلمانوں کا افلاس ایک ایسا مسلّم امر ہے کہ اس سے متعلق زیادہ تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تاہم اختصار کے ساتھ اس قدر ضرور کہونگا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے ذرائع معاش بالخصوص دو تھے یعنی ملازمت اور زمینداری اور ان دونوں کا انحصار زیادہ تر تقرب سلطانی پر تھا جب اس ملک میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے سلطنت نکلی اور ملازمت کے لیئے انگریزی تعلیم کی شرط ہوگئی تو اُس وقت سے مسلمان بڑے عہدوں سے خارج ہونے لگے چنانچہ اب ملازمت میں مسلمانوں کی جو نسبت ہے اس کی تفصیل سے ہمارے قومی اخبارات کے کالم آج کل پُر ہوتے ہیں اور اس وقت اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

۲۔ زمینداری مسلمانوں کا دوسرا مخصوص پیشہ زمینداری تھا مسلمان سب سے اوّل صوبہ سندھ کی طرف سے اس ملک میں داخل ہوئے تھے وہاں مسلمانوں کی مردم شماری اب تک تہتر فی صدی کے قریب ہے اور ملکیت آراضی کے اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ عرصہ دراز تک مسلمانوں کا صوبہ سندھ میں کوئی سہیم و شریک نہ تھا مگر گزشتہ دسمبر کی ۱۱ تاریخ کے ایک تعلیمی جلسہ میں جو حیدرآباد سندھ میں منعقد ہوا اُس صوبہ کے ایک معزز رکن جناب خان بہادر شاہ نواز خاں صاحب ممبر لیجسلیٹو کونسل نے فرمایا کہ مسلمانوں کی چالیس فی صدی زمینداری قرضہ میں جا چکی چالیس فی صدی اس وقت زیر بار قرضہ مکفول و رہن ہے

اور صرف بیس فی صدی باقی ہے صوبہ سندھ کے برابر مضبوط اور وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کی زمینداری تمام ہندوستان میں کہیں نہ تھی۔ جب وہاں اس حد تک نوبت پہونچ گئی تو دوسرے مقامات میں مسلمانوں کی حالت ظاہر ہے۔ چنانچہ اس وقت کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کی زمینداریاں سرعت کے ساتھ تلف نہ ہو رہی ہوں جن اصحاب کو اس میں شبہ ہو وہ مہینہ کی بیس تاریخ کو کسی کچہری میں جاکر دیکھ لیں کہ قرضہ کی علت میں کس قوم کے افراد کی جائدادوں کے نیلام بولے جاتے ہیں۔ بندوبست کی رپورٹوں کو ملاحظہ فرمالیں کہ ہر تیس سال کے بعد کس قوم کی جائدادیں دیگر اقوام کے قبضہ میں کس مقدار میں پہونچ جاتی ہیں ان کی تفصیلات طوالت کے اندیشہ سے ترک کرتا ہوں۔

۳۔ **شرح سود کی آزادی** اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی عملداری میں جس قدر قوانین نافذ ہوئے ان میں مسلمانوں کے لیئے سب سے زیادہ مضر قانون سود کا ثابت ہوا۔ یورپ اور انگلستان میں صدیوں کے تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ سود کو روکنے اور اس پر قانونی بندشیں لگانے سے شرح سود زیادہ ہو جاتی ہے اسلئے انگلستان نے رفتہ رفتہ ایسے قانون کو قطعًا منسوخ کردیا جس سے کثرت کے ساتھ روپیہ صنعت وحرفت اور کاروبار میں لگا اور شرح سود گر کر چار آنہ اور تین آنے سیکڑہ ماہوار تک پہونچ گئی اور ملک

کی دولت میں بے اندازہ ترقی ہوئی۔ اس تجربہ کو کامیاب دیکھ کر انگریزوں نے ۱۸۵۵ء میں ہندوستان میں بھی شرح محدود کرنے کا قانون منسوخ کر دیا۔ اس تبدیلی نے بقول شخصے سود ادا کرنے والی قوموں کو سود لینے کی قانون پر پہونچا دیا اور مسلمانوں کو جو روپیہ لینے کا رویہ میں شریک نہیں ہوئے تھوڑے عرصہ میں افلاس کی خندق میں گرا کر انھیں تباہ و برباد کر دیا۔

۴۔ قانون انتقال آراضی | اس حالت کو دیکھ کر حکام وقت کو اندیشہ ہوا کہ بالخصوص مسلمان زمیندار اور بالعموم دیگر اقوام کے زمیندار ننگے بھوکے ہو جانے پر ملک میں فساد اور بلوے کریں گے اس لیئے انھوں نے ایسے قوانین تجویز کیئے جن سے مسلمانوں کی زمینداریاں قایم رہیں۔ اس کے لیئے مختلف صوبوں میں مختلف قوانین جاری کیئے گئے جن کی تفصیل میں طوالت ہوگی مثلاً دکن میں شرح سود گھٹانے کا قانون پاس کیا گیا۔ صوبہ سندھ میں مقروض زمینداروں کی جائدادوں کا سرکاری طور پر انتظام کر کے قرضہ کی ادائگی کی سبیل کی گئی۔ پنجاب میں قانون انتقال آراضی پاس کیا گیا مگر ان قوانین سے اصلی مرض کا اب تک کوئی کارگر علاج نہ ہو سکا۔ قانون انتقال آراضی کی رو سے آراضی صرف ان اقوام کے نام منتقل ہو سکتی ہے جو زراعت پیشہ ہیں۔ اس سے جائدادوں کا انتقال ویشوں یعنی بنیوں کے نام بند ہو گیا مگر ان اقوام کے حق میں انتقال کا سلسلہ جاری ہے۔ جو زمینداری اور کاشتکاری پیشہ

ہونے کے ساتھ روپیہ کی داد وستد کا کام کرتے ہیں۔ اس لیے اب
مسلمانوں کی جائدادیں بجائے وبنیوں کے جاٹوں، گوجروں اور سکھوں کے نام منتقل ہوتی ہیں۔

۵۔ قرض نہ لینے کا عہد بیکار رہے بعض اصحاب کے دلوں میں یہ خیال گزرے گا کہ اگر مسلمان زمیندار عہد کرلیں کہ وہ کبھی قرض نہ لیں گے اور سادہ زندگی بسر کریں گے تو اُن کی جائدادیں محفوظ ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس عہد کو پورا کرنے میں سو مسلمان زمینداروں میں سے دو چار کامیاب ہو جائیں مگر موجودہ حالت میں یہ ناممکن ہے کہ مسلمان زمینداروں کی جماعت سود کی داد وستد سے بچ کر زمیندار باقی رہ سکے۔ اس مسئلہ کی نسبت ۱۸۹۶ء میں شمالی سندھ کے چند اضلاع میں تحقیقات کرائی گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو زمیندار برباد ہو رہے ہیں اُن میں ۹۰ فی صدی ایسے ہیں جو باوجود مسرف ہونے کے مقروض ہیں۔ اس حالت کو دیکھ کر مسٹر لائل نے جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں ڈپٹی کمشنر تھے مسلمانوں کی نسبت یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ رفتہ رفتہ محض کاشتکار رہ جائیں گے اور اس حالت پر پہنچ جائیں گے کہ نہ اُن کے پاس جائداد رہے گی جسے مکفول کر کے قرض لیں اور نہ جائداد سے محروم ہونے کا اُنھیں کوئی کھٹکا باقی رہے گا۔ اسی طرح ضلع مظفر نگر کی رپورٹ بندوبست میں تحریر ہے کہ گزشتہ تین سال میں وبنیوں کی جائداد پونے دو (۱¾) لاکھ ایکڑ سے بڑھ کر ڈھائی (۲½) لاکھ ایکڑ ہو گئی

مگر سیدوں کی جائداد ایک لاکھ ستاسی ہزار ایکڑ سے گھٹ کر ایک لاکھ ۹۴ ہزار ایکڑ رہ گئی۔ سادات کی نسبت رپورٹ مذکور میں تحریر ہے کہ وہ سب سے زیادہ جالندھر کی تحصیل میں ہیں، وہ نہایت مسرف ہیں اور انھیں اپنے اخراجات کو اپنی حالت کے مطابق رکھنے کا قطعاً اندازہ نہیں۔ اُن کا تنزل اس قدر سرعت کے ساتھ جاری ہے کہ جیسے کوئی شخص پہاڑ سے اُتر رہا ہو اور اگر یہ رفتار اسی طرح جاری رہی تو وہ بہت جلد مالکان آراضی کے زمرہ سے خارج ہو جائیں گے مگر جالندھر کا خاندان سادات جو نہایت اہمیت رکھتا ہے دیگر سادات سے مستثنیٰ ہے۔ یہ خاندان دادوستد کے ذریعہ سے سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے"

اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ عام طور پر سادات کا تنزل تیزی سے جاری ہے مگر اُن میں سے صرف وہ سادات جائدادیں بڑھا رہے ہیں جو مثل دیگر اقوام کے دادوستد سے پرہیز نہیں کرتے۔

ترمیم قانون سود کا امکان نہیں ہندوستان کے جدید دور میں جب سے کہ رعایا کو قانون سازی میں دخل ہوا مسلمانوں کے بعض افراد سود کے قانون میں عرصہ دراز سے ترمیمات پیش کر رہے ہیں مگر چونکہ کونسلوں میں مسلمانوں کی تعداد کم اور دیگر اقوام کی جو موجودہ قانون سود کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں تعداد زیادہ ہے اس لئے یہ اسباب ظاہر موجودہ قوانین باقی اور قائم رہیں گے جو انجام کار مسلمانوں کی زمینداریوں کو ختم کر دیں گے۔

۷۔ کاشتکاری اور انجمنہائے امداد باہمی زمینداری کے بعد کاشتکاری ذریعہ معاش ہی مگر صرف ان لوگوں کے لیئے جو روپیہ پیدا کرنا اور اُسے بڑھانا جانتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جو قرضداری کی وجہ سے زمینداریاں کھو چکے۔ بالخصوص کاشتکاروں اور بالعموم ادنیٰ زمینداروں کو قرضداری اور سود کی بلا سے نجات دینے کے لیئے اس ملک میں انجمنہائے امداد باہمی کا سلسلہ جاری ہوا ہی جس نے بہت کچھ فائدہ پہونچایا ہی۔ چنانچہ پنجاب میں گزشتہ دس سال میں انجمنہائے امداد باہمی کے اجرا کی وجہ سے دادوستد کرنے والوں کی تعداد بقدر دس فی صدی کے کم ہوگئی مگر افسوس کہ مسلمان بوجہ اس کے کہ انجمنہائے امداد باہمی میں کم شرح کا سود یا تجارتی سود لینا اور دینا پڑتا ہی، پوری طرح اس سلسلہ سے متمتع نہیں ہوسکتے۔ ان انجمنوں کی وجہ سے دیگر اقوام کا زراعت پیشہ طبقہ اپنی ادنیٰ حالت سے بڑھ کر یکسانیت کے ساتھ اُبھر رہا ہی۔ پس جبکہ ایک طرف ملک کے کاروبار پر سرمایہ داروں کا تسلط ہی دوسری طرف انجمنہائے امداد باہمی کے ذریعہ ملک کا ادنیٰ طبقہ بلند ہورہا ہی۔ مسلمان اگر دونوں تحریکوں میں سے کسی میں بھی شامل نہ ہوسکے تو اندیشہ ہی کہ اُن کے لیئے اُن دیہات میں بھی رہنے کی جگہ نہ رہے گی جہاں ثانی الذکر تحریک کی وجہ سے دیگر اقوام کی اقتصادی حالت بہتر اور تمدنی سطح بلند تر ہورہی ہی۔

۸۔ تجارت وصنعت زمینداری اور کاشتکاری کے بعد تجارت اور صنعت کا نمبر آتا ہی۔ ان پیشوں میں بھی صدیوں سے مسلمانوں کا

حصّہ رہا ہی مگر جب سے دنیا میں سرمایہ کا دَور دورہ ہوا ہی اور سرمایہ کا انحصار تجارتی سود کی داد ستد پہ ہو گیا ہی یہ پیشے یا تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے یا جو کچھ ہیں اُن کا اصلی نفع اُن سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جاتا ہی جن سے قرضہ لیکر مسلمان اپنا کاروبار چلاتے ہیں۔

پنجاب میں نسبتاً مسلمانوں کی حالت اچھی سمجھی جاتی ہی وہاں کے لوگ زندہ دل کہے جاتے ہیں وہاں کے قومی جلسوں میں ہزاروں اور لاکھوں روپیہ نقد جمع ہو جاتا ہی جس سے معلوم ہوتا ہی کہ وہاں کے لوگ خوش حال ہیں مگر وہ زندہ دل اور خوش حال دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے مقابلہ میں ہیں نہ کہ اپنے صوبہ کے ابنائے وطن کے مقابلہ میں، میں نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے گزشتہ سالانہ جلسہ میں مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا خاکہ پیش کیا تھا جس میں دکھایا تھا کہ محنت کر کے مال تیار کرنے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہی مگر مسلمانوں کی محنت سے نفع اٹھانے والے دیگر اقوام کے لوگ ہیں۔

۹ مسلمانانِ پنجاب کے اعداد پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد دیگر اقوام کے مساوی بلکہ قدرے زیادہ ہی۔ وہاں کپڑا بننے والے مسلمان دیگر اقوام سے دوگنے ہیں مگر کپڑا بیچ کر اُس سے اصلی نفع اٹھانے والے مسلمان نصف ہیں۔ آہنگروں یعنی ہتوڑا بجانے والوں میں مسلمان دوگنے سے زیادہ مگر لوہے کے دوکانداروں میں دیگر اقوام کے مقابلہ میں آٹھویں حصہ سے بھی کم ہیں۔ تیل نکالنے والوں میں مسلمان اٹھاون گنے مگر تیل کی تجارت میں

ایک ثلث سے کم ہیں۔

۱۰۔ صنعت مسلمانوں کو جب سب طرف سے دھکے ملتے ہیں تو وہ صنعت کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ حالاں کہ اب بھی کاریگروں میں ان کی تعداد کم نہیں بلکہ زیادہ ہے مثلاً صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی مردم شماری صرف چودہ فی صدی ہے مگر مسلمان کاریگر چوالیس فی صدی یعنی اپنی تعداد سے تین گونے ہیں اسی طرح پنجاب میں شیخوں اور کھتریوں کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجودے کہ شیخ تعداد میں کھتریوں سے کم ہیں تاہم کاریگروں میں دوگنے مگر کارخانوں کے مالک ہونے کے اعتبار سے پانچویں حصے سے بھی کم ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سرمایہ مسلمانوں کے پاس نہیں جس سے وہ کارخانے کھولیں اور جب کارخانے نہیں کھول سکتے تو صنعت و حرفت کے کام اختیار کرنے کے بجائے اس کے کہ تمام عمر ہاتھ پاؤں کی مشقت میں مثل بے زبان مویشیوں کے گزاریں اور کوئی صورت نہیں۔

اس وقت ہندوستان میں جو صنعت بہتر سے بہتر ہے اس میں مسلمانوں کا نمایاں حصہ ہے۔ کشمیر میں کپڑے اور کاڑھی اور چینی کا جو اعلیٰ درجہ کا کام ہوتا ہے اور جس کی شہرت یورپ تک ہے وہ سب مسلمانوں کا کام ہے مگر حالت یہ ہے کہ وہاں مسلمان کاریگر مثل کولہو کے بیل کے کام کر کے سدا مفلس اور قلاش رہتے ہیں جس کا رونا روزانہ اخبارات میں رویا جاتا ہے اور ان کی محنت و مشقت اور عرق ریزی کے پھل

دیگر اقوام کے لوگ کھاتے ہیں یہی حال بنارس، دہلی، علی گڑھ اور مراد آباد بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان کاریگروں کا ہے کہ وہ محنت کرتے کرتے ختم ہوتے جاتے ہیں اگر چند روز کے لیے بیکار یا بیمار ہو جاتے ہیں تو بھیک مانگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۱۱۔ تجارت میں نے تجارت کا جو مختصر خاکہ پیش کیا تھا اُس سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی تعداد اس میں کم ہے تاہم میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس قدر تعداد بھی تجارت میں مسلمانوں کی نظر آتی ہے وہ محض برائے نام ہی برائے نام اس لیئے ہے کہ مسلمان دوکاندار بھی بالعموم غیر اقوام کے سرمایہ داروں کا روپیہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مال منگانے میں انھیں تجارتی شرح سود دینا پڑتا ہے اور وہ لے سکتے نہیں بلکہ چھوٹے میں وہ سرمایہ داروں سے مدد لیتے ہیں جس کا انھیں قدم قدم پر سود دینا پڑتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے منافعہ کا بڑا حصّہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔

۱۲۔ سود سے بچنے کا مجوزہ علاج اس کا علاج بعض اصحاب یہ تجویز کرتے ہیں کہ مسلمان تجارت میں سودی قرضہ نہ لیں مگر اس زمانہ میں تجارت کے طریقے اس قسم کے ہو گئے ہیں کہ سود سے بچنا ناممکنات سے ہے بلکہ آج کل تو سخت اندیشہ اس امر کا ہے کہ اگر دیگر اقوام کی کوٹھیاں اور بینک وقت پر مسلمانوں کو سودی قرضہ دینا بند کر دیں تو مسلمانوں کا رہا سہا کام بھی ختم ہو جائے چنانچہ جب سے ہندو مسلم

تنازعات شروع ہوئے یہ شکایت اکثر جگہ سنی جاتی ہے کہ ہندؤوں نے مسلمانوں کو روپیہ دینا بند کردیا جس سے مسلمانوں کا کاروبار بگڑ گیا اور اب تو پنجاب کے ہندو اخبارات میں علانیہ لکھا جارہا ہے کہ مسلمانوں کو روپیہ دینا بند کردیا جائے۔ اس وقت لاکھوں مسلمان دکانداروں اور سکاریگروں کی زندگی کا انحصار اس پر ہے کہ وہ قرض لے کر جو کچھ کماتے ہیں اس کا ایک حصہ مہاجن کو دے دیتے ہیں اور باقیماندہ سے بسر اوقات کرتے ہیں۔ اس لیئے مسلمان آج کل اس مصیبت میں مبتلا ہیں کہ ایک طرف تو وہ سودی قرضہ سے کر برباد ہو رہے ہیں اور دوسری طرف اگر انھیں سودی قرضہ ملنا بند ہو جاتا ہے تو انھیں زندگی کے دن بھی پورے کرنے مشکل ہو جاتے ہیں۔

۱۳۔ اسلامی ریاستوں میں سود کی ڈگری

بعض اصحاب کے دلوں میں ممکن ہے کہ یہ خیال گذرے کہ انگریزی قوانین اس قسم کے ہیں کہ مسلمان سود دینے پر مجبور ہیں اس لیئے یہاں کے مسلمانوں کی مالی حالت کمزور ہوتی جاتی ہے مگر یہ ایک حیرت انگیز امر ہے کہ اسلامی ریاستوں میں مسلمانوں کو یہاں سے بھی زیادہ مجبوری ہے مثلاً بھوپال میں مستاجروں کا فرض ہے کہ وہ کاشتکاروں کے لیئے بیج اور کھاد اور مویشی فراہم کریں وہاں کا دستور یہ ہے کہ بیج کے لیئے مستاجر اپنے کاشتکاروں کو جس قدر غلہ دیتا ہے فصل پر اس سے سوایا پانے کا مستحق ہوتا ہے جس کو سوائی کہتے ہیں اور سب کو اس سوائی کی ڈگری عدالت سے مل سکتی ہے مگر خاص بات یہ ہے کہ

مسلمانوں کو سوائن کی ڈگری نہیں مل سکتی - اسی طرح وہاں غیر مسلموں کو بارہ آنے سیکڑہ تک سود کی ڈگریاں مل سکتی ہیں مگر مسلمانوں کو نہیں مل سکتی ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ غیر مسلم مسلمانوں سے سود وصول کر سکتے ہیں مگر مسلمان غیر مسلموں سے وصول نہیں کر سکتے اگر مسلمانوں کے مذہب میں سود کا لین اور دین دونوں ممنوع ہیں تو چاہیئے یہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دونوں کو نہ سود دینا پڑتا نہ لینا لیکن وہاں مسلمان سے تو جبریہ سود دلایا جاتا ہی مگر اسے حق نہیں کہ وہ غیر مسلم سے سود وصول کر سکے یہی حالت حیدرآباد اور دیگر اسلامی ریاستوں میں ہی کہ وہاں مسلمانوں پر تو سود کی ڈگریاں ہوتی ہیں اور ان کے گھر بار سود میں نیلام ہوتے ہیں مگر مسلمان نہ سود کی ڈگری پا سکتے ہیں نہ سود میں کسی کی جائداد نیلام کرا سکتے ہیں مسلمان ان باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں مگر واقعہ یہ ہی کہ مسلسل سود دینے کا مرض انسان کے لیئے تپ دق کا حکم رکھتا ہی جو ہر دم قومی جسم کو گھلا گھلا کر اسے فنا کرتا رہتا ہی۔[1]

۱۴- گداگری | ممکن ہی کہ بعض اصحاب کے دلوں میں یہ خیال گزرے کہ قوم زندہ رہے یا فنا ہو ہمارا دین و ایمان سلامت رہنا چاہیئے۔ اے کاش ! ہمارا دین و ایمان محفوظ و سلامت ہوتا تب بھی غنیمت تھا مگر اب تو وہ خطرہ میں ہی کیونکہ افلاس کی وجہ سے مسلمان ایسے حیا سوز پیشے اختیار کرنے پر

[1] سود مند کی کوشش سے خدا کا شکر ہی کہ ریاست بھوپال نے مسلمانوں کے لیئے اس بندش کو کہ انھیں سود کی ڈگری نہ ملے توڑ دیا ہی اور اب سوائن کی ڈگری مسلمانوں کو بھی مثل ہندوؤں کے مل سکتی ہی۔

مجبور ہیں جن سے اخلاق پست اور مذہبی روح فنا ہوتی جاتی ہے مثلاً صوبہ متحدہ میں اپنی نسبتی مردم شماری کے اعتبار سے مسلمان گداگروں کی تعداد تین گونی اور قزاقوں اور کسبیوں کی تعداد سات گونی ہے ان سب سے زیادہ شرمناک امر یہ ہے کہ پنجاب میں جاٹ جھینور، کمہار اور جولاہوں میں سے جن میں کچھ ہندو کچھ سکھ اور کچھ مسلمان ہیں مسلمانوں میں سے تو اُن کی ایک خاص تعداد گداگر اور کنچن ہے مگر ہندوؤں اور سکھوں میں مندرجہ بالا ذاتوں کے لوگ برائے نام گداگر اور کنچن ہیں ایک وہ زمانہ تھا جب کہ مذہب اسلام اختیار کرنے سے انسانوں کے اخلاق بلند ہو جاتے تھے اور اب وہ وقت ہے کہ اس کے خلاف ہو رہا ہے اور صدہا مسلمان غیر اقوام کے شکار بن رہے ہیں

۱۵۔ تعلیم میں انحطاط بالآخر اب مسئلہ یہ ہے کہ اس پستی سے نکلنے کا کوئی علاج ہے بھی یا سراسر مایوسی ہی مایوسی ہے اس وقت سے پچاس سال قبل جو علاج تجویز کیا گیا وہ حصول علم تھا چنانچہ علوم جدیدہ اور علوم قدیمہ کی تحصیل اور قوم میں اُن کی ترویج کا تجربہ عرصے سے کیا جا رہا ہے اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حصول علم ہی کے ذریعہ سے مذہبی، اخلاقی اور دماغی ترقی کا امکان ہے مگر اب مشکل یہ آن کر واقع ہوئی ہے کہ اس زمانہ میں علم بھی بغیر سرمایہ کی مدد کے حاصل نہیں ہو سکتا اور سرمایہ کی چونکہ مسلمانوں میں قلت ہے اس لیئے علم کے دروازے بھی اُن پر بند ہوئے جاتے ہیں تعلیمی رپورٹوں سے جن کی تفصیل میں یہاں طوالت ہوگی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مدارس میں مسلمان طلبا کی جو نسبت ہے وہ اعلیٰ جماعتوں میں جن میں

اخراجات زیادہ ہیں بتدریج کم ہوتی جاتی ہے اسی طرح علوم قدیمہ کے مدارس کی جو مالی مشکلات ہیں وہ بھی ظاہر ہیں کہ باوجود چندہ کی مسلسل اپیلوں کے عربی مدارس کے اخراجات کے لیئے کافی روپیہ نہیں ملتا اور جو ملتا ہے وہ بوجہ اس کے کہ بینک میں رکھ کر اُس کا سود نہیں لیا جا سکتا چند روز میں ختم ہو جاتا ہے تعلیم کے علاوہ صنعت و حرفت اور تجارت کو بھی ذریعہ ترقی سمجھا جاتا ہے جن کی نسبت تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے کہ بغیر سرمایہ کے وہ چل نہیں سکتیں اور سرمایہ بغیر روپیہ کا کرایہ لیئے نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ قایم رہ سکتا ہے اب ایک آخری چیز جو تمام قوم و ملک کے مطمح نظر ہے وہ اس ملک کی سیاسی آزادی یعنی سوراج ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ سیاسی آزادی سے بڑھ کر کسی قوم کے لیئے دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہو سکتی مگر مسلمانوں کے لیئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس ملک میں رعایا کو حکمرانی کے جو حقوق ملنے والے ہیں مسلمان اُن سے مستفید ہونے کے لیئے کہاں تک تیار ہیں مسلمانوں کو سب سے اوّل یہ سوچنا چاہیئے کہ جہاں اُن کی خالص قومی سلطنت ہزار سال سے تھی وہاں ان کا زوال کیسے ہوا اور اب قومی اور ملکی سلطنت کے قیام و استحکام کے لیئے کیا امور ضروری ہیں جیسے ہی جہاں تک محدود واقفیت ہے سلطنت کی بقا کے لیئے اس زمانہ میں سرمایہ شرط لازمی ہے۔

۱۶۔ **زمانہ حال میں ملک داری کا طریقہ** زمانہ سابق میں افراد جس طرح ناگہانی ضرورتوں کے لیئے پس انداز روپیہ زمین میں دفن کر کے رکھتے تھے

اسی طرح سلطنتیں اپنے خزانوں میں بے شمار روپیہ محفوظ رکھتی تھیں تاکہ فوج کشی یا کسی بیرونی حملہ کی مدافعت کے وقت وہ کام آئے۔ مگر جب سے روپیہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کا طریقہ جاری ہوا تب سے اہل یورپ نے روپیہ کو بیکار پڑا رہنے کا سلسلہ مسدود کردیا اور سرکاری خزانوں میں سے روپیہ نکال کر ملک کے نفع کے کاموں میں لگانا شروع کردیا اور یہ طرزِ عمل قرار دیا کہ جب سلطنت کو روپیہ کی ضرورت ہو تو افراد قوم سے معین منافع پر قرض لے کر ملک کی ترقی کے کاموں میں یا فوج کشی میں صرف کیا جائے اور پھر اس کو رفتہ رفتہ ادا کردیا جائے۔ اس طریقہ کے اجرا سے افراد قوم کو یہ نفع ہوا کہ جب اُن کے روپیہ پر بھروسہ کے ساتھ منافع ملنے لگا تو انھیں پس انداز کرنے کی رغبت اور کفایت شعاری کی عادت ہوگئی اور ملک کو یہ نفع ہوا کہ کروڑوں اور اربوں روپیہ جو سرکاری خزانوں یا افراد قوم کے گھروں میں مدفون اور بیکار پڑا رہتا تھا وہ کارآمد اور نفع آور کاموں میں لگنے لگا جس سے اہل ملک کی انفرادی اور اجتماعی ترقی کی کوئی حد و انتہا نہ رہی۔

مگر اس جدید طریقہ کے اختیار کرنے سے جس نسبت سے یورپ کی سلطنتوں کو نفع ہوا اسی نسبت سے اسلامی حکومتوں کو جنھوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا نقصان ہوا۔ مثلاً یہ کہ اسلامی سلطنتوں کو جب قرضے کی ضرورت ہوتی تو بوجہ اس کے کہ افراد قوم معین منافع پر سلطنت کو قرض دینا ناجائز سمجھتے تھے سلطنت بجائے اپنی رعایا اور اپنی قوم سے

قرضہ لینے کے دیگر اقوام سے قرضہ لینے پر مجبور ہوتی تھی۔ اس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ قرضہ پر جو کچھ منافع ہوتا وہ غیر ممالک کو جاتا جس سے ملک روز بروز مفلس ہوتا گیا افراد قوم کے لیے کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ پس انداز روپیہ کو معین منافع پر لگا کر اپنا سرمایہ بڑھاتے اور اس شوق میں کفایت شعاری سیکھتے۔ ملک میں اس قسم کے سامان نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ افراد قوم مسرف اور انجام کار مفلس ہو گئے اور سلطنت دیگر اقوام کی مقروض اور دست نگر ہو گئی حتیٰ کہ قرضہ کے معاوضہ میں دیگر اقوام نے یا تو اسلامی سلطنتوں کو رہن رکھ لیا یا اندرون ملک میں اپنی قوم اور اپنی تجارت کے لیے ایسے ایسے حقوق حاصل کر لیے جن سے عملاً نظام سلطنت اُن کے ہاتھوں میں چلا گیا اور مسلمان برائے نام بادشاہ رہ گئے چنانچہ فرداً فرداً ہر اسلامی سلطنت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں غیر اقوام کے پنجہ میں گرفتار رہی اور محض مالی کمزوری کی وجہ سے غیروں کے قبضہ میں چلی گئی ہے اور مسلمانوں کی تمام شجاعت و جواں مردی، جرات و ہمت، دلیری اور اولوالعزمی سب رکھی رہ گئیں۔

۷۔ مسلمان ملک کی ترقی میں ہیچ ہیں پس جبکہ خالص مسلمانوں کی سلطنتیں سرمایہ کی قلت سے اُن کے ہاتھوں سے نکل گئیں اور نکل رہی ہیں یہ توقع کرنا بعید از قیاس ہے کہ ہندوستان میں جہاں تعداد میں مسلمانوں کا چہارم حصہ اور اعلیٰ تعلیم اور دولت و تموّل میں اس سے بھی قلیل حصہ ہے

حصول سوراج میں وہ ممد ہو سکیں گے ممد ہونا تو بڑی بات ہے میں تو مسلمانوں
کو ملک کی ترقی میں ہارج اور مانع سمجھتا ہوں۔ مثلاً ملک کا سرمایہ حقیقی معنوں
میں وہی ہے جو ریل، تار، نہر، صنعتی اور تجارتی کاموں میں لگا ہو جس سے ملک
کی تمدنی سطح بلند ہو۔ موجودہ حالت میں دیگر اقوام ہند کا روپیہ زیادہ تر
بجائے نفع آور کاموں میں لگنے کے مسلمانوں کو سودی قرضہ دینے اور ان سے
جائدادیں حاصل کرنے میں صرف ہو رہا ہے اور چونکہ مسلمان ہر دم روپیہ
ملنے کے خواہشمند رہتے ہیں اس لیئے یہاں شرح سود بھی گراں رہتی ہے۔ اس
وقت مسلمان اگر اپنا پیدا کیا ہوا روپیہ معین اور غیر معین منافع پر تجارت اور
کارخانوں میں لگانے لگیں تو ہمارے برادران وطن کا روپیہ بھی بجائے
مسلمانوں کی بربادی پر صرف ہونے کے ملک کے حقیقی نفع کے کاموں میں
لگنا شروع ہو جائے جس سے شرح سود یقینی طور پر گھٹے اور ملک سے ربوا
اسی طرح کم ہو جائے جس طرح کہ یورپ اور امریکہ سے کم ہو گیا۔ جب مسلمان
ملک کا سرمایہ اور دولت بڑھانے میں حصہ رسد شریک ہوں گے اور
ہندوستان کی ریلوں، نہروں اور کارخانوں کو دیگر ممالک کے سرمایہ سے
مستغنی کر دیں گے تب اس ملک کے حقیقی سوراج کا وقت ہوگا۔ موجودہ حالت
میں جب ملکی ترقی کے لیئے قرضہ کا اعلان ہوتا ہے تو یورپ کے مہاجن پانچ اور
چھ فی صدی کی شرح سود پر ہندوستان کے اربوں روپیہ کے تمسکات
آناً فاناً خرید لیتے ہیں محض اس لیئے کہ ہندوستان کے سرمایہ داروں کو تو
بے کھٹکے اپنے روپیہ پر بارہ اور چوبیس فی صدی بلکہ اس سے زیادہ تک مسلمانوں

سے ملتا ہے، انھیں کیا ضرورت ہے کہ وہ کم سود کے تمسکات خریدیں۔ روس کے بالشویک مدتوں تک سرمایہ سے لڑتے رہے مگر جب تمام ملک فاقہ کشی سے مرنے لگا تو انجام کار یورپ کے سرمایہ داروں کی خوشامد کر کے اپنے ملک میں اُن کا سرمایہ لگانے پر مجبور ہوئے۔ یہی حالت ہمارے ملک کی ہے کہ ملک کی ترقی کے کاموں کا انحصار تو بیرونی سرمایہ پر ہے اور ہم خواب دیکھتے ہیں سوراج کا، گویا جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کے خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقی سوراج کی بنیاد اُس روز پڑے گی جب ملک کا سرمایہ بڑھانے میں مسلمان بھی زور لگا کر ملک کی شرح سود اس قدر گرا دیں گے کہ یہاں کا روپیہ بھی دیگر ممالک کے روپیہ کا مقابلہ کرنے لگے گا مگر ابھی وہ وقت بہت دور ہے جب کہ مسلمان ملک کی ترقی میں واقعی طور پر حصہ لے سکیں۔ اس وقت تو سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی بقا کا ہے جس کا انحصار محض مسئلہ سود کے طے ہونے پر ہے، اور بس۔

۱۰۔ سود کا مسئلہ غیر منفصل رہا ہے

سود کے مسئلہ میں سب سے زیادہ غور طلب امر یہ ہے کہ اُس کی حرمت کی نسبت شرعی احکام قطعی ہیں یا اس کی علت کا بھی کوئی پہلو نکل سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی نسبت روایت ہے کہ انھیں اس بات کا افسوس رہا کہ آنحضرت صلعم انتقال فرما گئے اور اُن سے ربوٰا کے معنے نہ پوچھے گئے۔ ربوٰا کے معنے نہ پوچھ سکنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حرمت ربوٰا کی آیت نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلعم صرف نو روز

زندہ رہے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ ابتدا سے غیر منفصل رہا ہے آخر زمانہ میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کی بنا پر غیر مسلموں سے سود لینے کے جواز کا فتوے دیا تاہم مسلمان من حیث القوم سود لینے سے بچتے رہے صرف اس خیال سے کہ جس امر کا جواز مشتبہ ہو اس سے بچنا بہتر ہی اور بچنا اس نیت سے تھا کہ مسلمان خواہ دُنیاوی اعتبار سے کیسے ہی برباد کیوں نہ ہو جائیں مگر سود لینے کے گناہ سے بچے رہیں

۱۹۔ سود سے بچنا محال ہی دنیا کے ابتدائی دور میں سودی قرضہ زیادہ تر ضرورتمندی کی وجہ سے لیا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں روپیہ قرض لیکر نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہی جس کی وجہ سے تمام کاروبار و تجارت اور صنعت و حرفت کا انحصار سودی قرضہ کے لین دین پر ہوگیا ہی اس لیئے اگر سود لینے سے نہیں تو سود دینے سے بچنا انسان کے لیئے تقریباً محال ہوگیا ہی۔ بالخصوص اُن جماعتوں کا تو سود دینے سے بچے رہنا ناممکن ہی جو سود نہیں لیتیں اور چونکہ مسلمان سود لینے سے بچے رہے اس لیئے وہ من حیث القوم دُنیا میں سب سے زیادہ زیر بار قرضہ اور سب سے بڑھ کر سود کے دینے والے ہیں جس کی وجہ سے دنیوی بربادی کے ساتھ وہ سود کے گناہ میں بھی سب سے زیادہ ملوث رہتے ہیں۔

۲۰۔ سود میں منفعت کا پہلو غالب ہوگیا دنیا میں ہر چیز کے دو پہلو

ہوتے ہیں مفید اور مضر، حتیٰ کہ شراب اور جوئے جیسی ناپاک چیزوں میں نفع کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور موجود ہے جس کی نسبت باری تعالیٰ کا ارشاد ہے وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (سورہ بقرہ ع ۲۷)
مگر مضرت کے غلبہ کی وجہ سے شراب کا پینا بجز اُس صورت کے کہ طبیب حاذق اُس کا حکم دے حرام ہے اسی طرح سود کے کاروبار میں بھی مضرت کا پہلو ابتدا میں غالب تھا جس کی وجہ سے جملہ مذاہب عالم میں وہ ممنوع تھا مگر امتداد زمانہ سے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرض لیا ہوا روپیہ صنعت و تجارت میں لگا کر دائن اور مدیون دونوں کے لیئے نفع رساں ثابت ہوا جس کی وجہ سے روپیہ کے کرایہ یا سود کی منفعت کا پہلو اس کی مضرت سے بڑھ گیا۔ جملہ دیگر اقوام دنیا نے اس نکتہ کو سمجھ کر اُس کی دو قسمیں قرار دے لیں یعنی یوزری اور انٹرسٹ جن کو دوسرے الفاظ میں ربوٰا اور تجارتی سود کہہ سکتے ہیں اور ثانی الذکر یعنی تجارتی سود سے سب نے بجز مسلمانوں کے خاطر خواہ نفع اُٹھایا۔ مسلمانوں کے مذہب میں اگرچہ یہ مسئلہ ابتدا سے غیر منفصل رہا اور ربوٰا کی کوئی تعریف قطعی اور متفق علیہ نہ تھی تاہم اُنھوں نے روپیہ پر ہر بڑھوتری کو ربوٰا قرار دے کر اُس کی جملہ صورتوں سے کلیتاً احتراز کیا اور سود کے سراسر مفید پہلو یعنی تجارتی سود تک سے بھی نفع نہ اُٹھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دین و دُنیا دونوں برباد ہوگئے۔ دُنیا کی بربادی تو

مسلمانوں کے افلاس سے ظاہر ہے مگر دین کی بربادی اس لیئے ہوئی کہ سود لینے کے گناہ میں نہیں تو دینے کے گناہ میں مسلمان سب سے آگے ہو گئے حالاں کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا تھا کہ :-

"مسلمان کو چاہیئے کہ کافر حربی کو سود دینے میں احتیاط کرے بے ضرورت کافر حربی کو بھی سود نہ دیوے"

سود دینے کے گناہ کے علاوہ آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ مسلمان کاریگر بمقابلہ دیگر اقوام کے کاریگروں کے زیادہ شراب خوار اور عیاش ہیں جس کا پتہ آبکاری کے نقشوں سے چلتا ہے چنانچہ مجھے بالتحقیق معلوم ہوا ہے کہ بعض مقامات میں جہاں مسلمان کاریگر زیادہ ہیں عید کے دن شراب کی بکری بہت زیادہ ہوتی ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ روپیہ بڑھانے کے دروازے چوں کہ مسلمانوں پر بند ہیں اس لیئے وہ اپنی کمائی کا مصرف صرف عیش پرستی جانتے ہیں۔

۲۱۔ مذہب کی عظمت خطرہ میں | ممکن ہے کہ بعض صاحب کے دل میں یہ خیال گزرے کہ دنیوی مصالح سے مذہب میں تبدیلی نہیں کی جاتی اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ کوئی قانون خواہ مذہبی ہو یا ملکی جس میں ضرورت زمانہ اور طبائع انسانی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا اس کا وجود بالآخر محض کتابوں کے صفحات پر رہ جاتا ہے کیوں کہ لوگ اپنے حوائج سے مجبور ہو کر پوشیدہ یا علانیہ اس کی خلاف ورزی کرنے لگتے ہیں یا اس سے

بچنے کے لیئے حیلے اختیار کرتے ہیں اس لیئے ایسے قانون کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے اور اسی لیئے ہر مقنن اپنے قانون میں ان امور کا لحاظ رکھتا ہے۔ چنانچہ قانون الٰہی میں خود باری تعالےٰ کا ارشاد ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ مذہبی امور میں ضروریات زمانہ اور طبائع انسانی کا لحاظ نہ رکھنے کی بدیہی مثال ہمارے سامنے اہل یورپ کی موجود ہے جنھوں نے اپنے مذہبی قانون کو اپنی ضروریات کے لیئے ناکافی پاکر اپنے حسب حال ملکی قوانین بنا لیئے اور اپنی آسمانی کتابوں کو پس پشت ڈال دیا۔ تقریباً یہی حال مسلمانوں کا ہوتا جاتا ہے کہ وہ اپنے مروجہ مذہبی قانون کو اپنی ضروریات کے مطابق نہ پاکر بہ اعتبار عمل کے آزاد ہوئے جاتے ہیں اور ان کے دلوں سے مذہبی قانون کی عظمت کم ہوتی جاتی ہے مثلاً یہ کہ باوجود اس علم کے کہ سود لینا اور دینا دونوں ممنوع ہیں جہلا سے لیکر علما تک ضرورت کے وقت اگر سود لینے کے نہیں تو دینے کے گناہ کے ضرور با ضرور مرتکب ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں اس قانون کی کیا عظمت ہو سکتی ہے جو ہر دم اور ہر وقت توڑا جاتا ہو اور جس پر عمل درآمد کرنا انسانی امکان سے باہر ہو گیا ہو۔ ایسی مشکلات کے حل کرنے کے لیئے مسلمانوں میں ابتدا سے فقہا اور مجتہدین کی ایک مقدس جماعت ایسی رہی ہے جو نہ صرف مذہبی امور میں بلکہ تمدن و معاشرت میں مسلمانوں کی رہنمائی کرکے انھیں دنیا میں رہنے کے قابل بناتی رہی چنانچہ اسی مقدس جماعت کے بعض برگزیدہ افراد نے مختلف اوقات میں مسئلہ سود کی اہمیت کا اندازہ کرکے اس کی مختلف صورتوں کے متعلق

فتوے دیئے ہیں جن پر یکجائی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مسئلہ سود بڑی حد تک حل ہو چکا ہے اور صرف اس میں علماء وقت کی یکجائی اور متفقہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اس وقت میں اختصار کے ساتھ سود کی مختلف صورتیں اور اُن کے متعلق چند فتوے پیش کرنے کی جرات کرتا ہوں۔

۲۲۔ غیر مسلموں سے ربوا ہندوستان میں سب سے اہم فتوے شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جنھوں نے غیر مسلموں سے نہ صرف تجارتی سود بلکہ ہر قسم کے سود اور ربوا کے جس میں گراں شرح کا سود بھی شامل ہے جواز کا فتویٰ دیا۔ اسی کے ساتھ شاہ صاحب موصوف نے ہنڈی کے جواز کی صورت بتائی جس کے ذریعہ تجارتی اغراض کے لیے ایک مقام سے دوسرے مقام پر روپیہ منتقل ہو سکتا ہے۔

۲۳۔ پرامیسری نوٹوں اور بنکوں کا سود اس کے بعد مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے سرکاری تمسکات اور نصاریٰ کے پاس روپیہ جمع کر کے اس پر سود لینے کے جواز کا فتوے دیا۔

۲۴۔ بنک کا سود کار خیر میں بنک کا سود لیکر کار خیر میں صرف کرنے کے جواز کے متعلق جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند کے الفاظ یہ ہیں کہ

اُس روپیہ کو بنک میں نہ چھوڑیں بلکہ وہاں سے لیکر غربا و مساکین اہل حاجت میں تقسیم کردیں یہ بہت اچھا ہے اور انشاء اللہ تعالےٰ

اس کا ثواب حاصل ہوگا۔"

۲۵۔ ربوا الفضل کے جواز کی صورت

ہمجنس اشیا کا غیر مساوی تبادلہ بھی سود یا ربوا الفضل کے حکم میں سمجھا جاتا ہے اور اس لیئے وہ ناجائز ہے یعنی چاندی کی خرید و فروخت جب روپیہ سے کی جائے تو روپیہ اور چاندی کا وزن یکساں ہونا چاہیئے مگر چونکہ چاندی کا بھاؤ کم و بیش ہوتا رہتا ہے جس کی وجہ سے بعض وقت اس کی خریداری میں نقصان رہتا ہے اس لیئے فقہا نے مسلمانوں کو نقصان سے بچانے کے لیئے یہ صورت نکال لی ہے کہ روپیہ کے ساتھ تانبے کے کچھ پیسے ملا دیئے جائیں تاکہ بدلین غیر جنس ہو جائیں اور یہ معاملہ ربوا نہ رہے اور روپیہ کے بدلے میں وزن کے اعتبار سے زیادہ چاندی مل سکے۔

۲۶۔ آپس میں مسلمانوں میں مضاربت بہ رقم معین

اس کے بعد سود کی ایک صورت جو سب سے اہم ہے باقی رہتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو روپیہ دے کر مضاربت بہ رقم معین کا معاملہ کرے یعنی کاروبار اور تجارت کے لیئے معین منافع پر روپیہ دے۔ اس وقت لاکھوں مسلمان دوکاندار اور کاریگر جو غیر اقوام کے سرمایہ داروں کا روپیہ استعمال کر کے سدا اُن کی غلامی میں رہتے ہیں اور بعض وقت روپیہ کے دباؤ میں تبدیل مذہب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اُنھیں اس غلامی سے آزادی دلانے کی صرف یہی صورت ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اسراف فضولخرچی اور عیاشی کے لیئے نہیں بلکہ کاروبار کے لیئے خفیف منافعہ پر روپیہ دے

تاکہ خود مسلمانوں کی حیثیت تجارت و صنعت میں قائم ہو۔ اس صورت کے جواز کے متعلق علماء مصر نے جو کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ خود ہمارے ہندوستان کے عالم مولوی ناظر حسن صاحب دیوبندی مرحوم کی ایک کتاب سے نقل کرنا بیجا نہ ہوگا۔

"یہ کلیہ کہ نقد مال کا کرایہ درست نہیں ہے بروئے کتب فقہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں کچھ تفصیل ہے۔ اگر اس کا کرایہ علاوہ تجارت کے اور کسی غرض سے ہو تو بے شک نادرست ہے کیونکہ نقد مال کی ذات سے بلا خرچ کیے ہوئے کوئی نفع حاصل نہیں ہوسکتا ہے اور کرایہ اس چیز کا درست ہوتا ہے جس میں بحالت بقاء کوئی نفع حاصل ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ خیال کہ تجارت کے لیے بھی اس کا کرایہ درست نہیں ہے ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ نقد اموال کی اصلی منفعت تجارت ہے۔ اگر نقد مال کا معاوضہ لینا شرعاً حرام تھا تو مضاربت صحیحہ میں حصہ مشاع کا لینا کیوں حلال ہوا۔ اس صورت میں رب المال نے جو کچھ لیا عوض المال لیا اور مضارب نے جو کچھ لیا عوض العمل لیا۔ اس مسئلہ سے بھی معلوم ہوا کہ مضاربت میں مال مدفوع قرض نہیں ہوتا ہے ورنہ ایک حبہ بھی لینا حرام ہوتا۔"

آگے چل کر جناب مولوی ناظر حسن صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔
"جیسے زمین کاشت کا اجارہ مشاع اور بہ لگان مقرر درست ہے

اور در صورت لگان اگرچہ کاشتکار کو کچھ حاصل نہ ہو لیکن مالک
زمین کو رقم لگان حلال ہے۔ ایسے ہی عقد مضاربت بھی
دونوں طرح درست ہوئی بحصہ مشاع بھی اور بہ رقم متعین
بھی!!

۴۳- متفقہ فتوے کی ضرورت | علماء کرام کی مندرجہ بالا رایوں و فتوؤں کے نقل کرنے سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ جو کچھ کہا اور لکھا گیا وہ قطعی ہے اور ناقابل اعتراض ہے بلکہ میرا منشاء صرف اس قدر ہے کہ سود کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن کے جواز کی نسبت خود بڑے بڑے علماء کرام اظہار رائے کر چکے ہیں فتوے دے چکے ہیں اور یہ فتوے خاص خاص اوقات میں خاص ضروریات کو پیش نظر رکھ کر دیئے گئے ہیں مگر جو حالات اس وقت مسلمانوں کے سامنے ہیں اور جن کو میں نے اختصار کے ساتھ عرض کیا ہے وہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ علماء کرام اجماعی طور پر اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیکر ایک متفقہ فتوے جاری کریں اور اس پر عمل درآمد کرانے کی خاص طور پر کوشش کریں اور کاروبار تجارت میں مسلمانوں کی رہنمائی کر کے انھیں ایسے طریقے بتائیں جنھیں اختیار کر کے مسلمان جلد سے جلد ذلت و خواری، ہلاکت و بربادی کے بھنور سے نکلیں ورنہ کچھ عرصہ اور غفلت برتی گئی تو اندیشہ ہے کہ کوئی تدبیر کارگر نہ ہو سکے گی۔ اور خدانخواستہ اکبر کا یہ شعر ہم پر صادق آئے گا

کچھ جزو خاک ہو گئے کچھ ہونگے جزو غیر
یہ واقعہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

(۳)
مسئلہ سود پر چند سوالات

میں نے سنہ ۱۹۳۴ء میں مسئلہ سود کے متعلق چند سوالات شائع کیے تھے امید ہے کہ اُن کے ملاحظہ سے اس مسئلہ کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ اس لیے انھیں ذیل میں نقل کرتا ہوں :-

۱- آیا دنیا کے جملہ بڑے مذاہب میں سود ممنوع رہا ہے یا صرف اسلام میں؟

۲- کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہندوؤں، مصریوں، اہل روم اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے قوانین کی رو سے سود خواری ممنوع تھی اُسے بند کرنے کی ہر ممکن کوشش ہر زمانہ میں کی گئی ہے؟

۳- جب دینی اور دنیوی دونوں قوانین کی رو سے سود خواری ممنوع تھی تو سوال یہ ہے کہ آیا سود خواری کی ممانعت کسی مضرت پر مبنی تھی یا بلا لحاظ مضرت و منفعت کے محض حکم خداوندی پر تھی؟

۴- جب تک کہ روپیہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کا رواج نہ تھا تب تک یا تو روپیہ زمین میں دفن کر کے رکھا جاتا تھا یا ضرورتمندوں اور عیش پرستوں کو سود پر قرض دیا جاتا تھا جو مدیون کی بربادی کا باعث ہوتا تھا اور یہی ممنوعہ سود خواری تھی آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ جب سے روپیہ نفع آور کاموں میں لگنے اور ایک دوسرے سے معین منافع پر قرض لیکر تجارت میں لگایا جانے لگا تب سے اُن ممالک کی دولتمندی

اور قوت و عظمت کی بنیاد قایم ہوئی اور سرمایہ و تجارت کے زور سے انھوں نے غیر ممالک پر قبضہ و تسلط کرنا شروع کیا؟

۵- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ سود کی تبدیل شدہ صورت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے اسلامی سلطنتوں کو اپنی ملک کی حفاظت و ترقی کے لیئے بجائے اپنی رعایا سے قرضہ لینے کے دیگر اقوام سے سودی قرضہ لینا پڑا جس سے اسلامی ممالک مثلاً دوسروں کے قبضہ میں چلے گئے؟

۶- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی زمینداریاں روز بروز نکل رہی ہیں اُن کی جائدادیں قرضہ کی علت میں دوسروں کے قبضہ میں جا رہی ہیں اور وہ مثل اُن اسلاف زمانہ کے یہودیوں کے زمین سے بے دخل ہو رہے ہیں؟

۷- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ سود کی تبدیل شدہ صورت اختیار نہ کرنے کی وجہ سے مسلمان تجارت سے خارج ہو رہے ہیں اور باوجود اسکے کہ مسلمان کاریگروں کی تعداد بہت ہے تاہم وہ دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام ہیں اور اس لیئے صنعت و حرفت کے اصلی نفع سے محروم ہیں؟

۸- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کی مالی کمزوری کی وجہ سے اُن میں نفع خلائق کے کام مثلاً مدرسے شفاخانے خیرات خانے مہمان خانے کنوئیں سرائیں اور پل بنانے والوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے اور اس نسبت سے دیگر اقوام میں کار خیر جاری کرنے والوں کی تعداد بڑھ رہی ہے؟

۹- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمانوں میں آپس میں

تنازعات زیادہ ہیں اور باہمی ہمدردی اور مصیبت میں ایک دوسرے کی امداد کرنے کی کم نوبت آتی ہی اور اگر یہ صحیح ہی تو کیا یہ اُن کے افلاس کا نتیجہ نہیں ہی ؟

۱۰- آیا یہ صحیح نہیں ہی کہ بعض مقامات میں افلاس کی وجہ سے اُن اقوام میں جو عرصہ سے مسلمان تھیں ارتداد شروع ہو گیا ہی اور ارتداد کو روکنے کے لیے مسلمانوں کی طرف سے جو جماعتیں قائم ہوئی ہیں اُنھیں بوجہ روپیہ کی کمی کے تبلیغ کا کام جاری رکھنا مشکل ہو رہا ہی ؟

۱۱- اگر مسلمانوں کی مالی کمزوری کی وجہ سے ہر اعتبار سے اُن کا تنزل ہی تو کیا یہ ضروری نہیں ہی کہ مسلمانوں کی حالت درست کی جائے اور مالی حالت درست کرنے کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں ؟

۱۲- مسلمانوں کی مالی کمزوری زیادہ تر اُن کی قرضداری کی وجہ سے ہو رہی ہی کیا یہ ممکن ہی کہ مسلمانوں کی قوم یہ عہد کر لے کہ وہ سودی قرضہ نہ لے گی مگر جب کہ صدیوں تک مذہبًا اور قانونًا سود پر قرض دینے اور لینے والوں کو سزا دی جاتی تھی تب بھی سودی قرضہ کی داد وستد بند نہ ہو سکی تو آیا یہ بات قرین قیاس ہی کہ قرض نہ لینے کا عہد مسلمان من حیث القوم پورا کر سکیں گے ؟

۱۳- اگر افلاس دور کرنے کے لیے کفایت شعاری کی عادت ضروری ہی تو آیا محض کفایت شعاری کی تلقین سے قوم کفایت شعار بن سکتی ہی اور باوجودیکہ مسلمانوں میں عرصہ سے کفایت شعاری کی ضرورت کا احساس ہی

اور ہر طرف اس کا چرچا ہو اور اُس کے لیے انجمنیں قایم ہو چکی ہیں نصیحتیں اور وعظ کہے جا چکے ہیں تاہم اُن کے مسرفانہ عادات میں کمی نہیں ہوتی اور وہ روز بروز تباہ ہوتے جارہے ہیں اتنے تجربوں کے بعد کیا اس امر کی گنجایش باقی ہو کہ وعظ و پند کے ذریعہ سے قوم میں کفایت شعاری پیدا کرنے کے تجربہ میں چند سال اور ضایع یا صرف کر دیئے جائیں ؟

۱۴-آیا یہ صحیح نہیں ہو کہ کسی قوم میں کفایت شعاری اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے افراد کو روپیہ بڑھانا نہ سکھایا جائے جیسا کہ یورپ میں کاریگروں اور غربا کے لیے بنیک اور بیمہ کمپنیاں قایم کر کے اور انھیں روپیہ کا بچانا اور بڑھانا سکھا کر تجارتی سود کے ذریعہ سے انہیں حقیقی معنوں میں کفایت شعار بنایا جاتا ہو ؟

۱۵-اس زمانہ کے کاروبار میں بعض لوگوں کے پاس بے شمار دولت جمع ہو جاتی ہو جس کو "سرمایہ داری" کہتے ہیں اور جس سے غربا سرمایہ داروں کے غلام بن جاتے ہیں۔ سرمایہ داری کی قوت اور اُس کی مضرت کے مقابلہ کے لیئے غربا میں اب انجمن ہائے امداد باہمی کی تحریک ترقی کر رہی ہو جس سے غربا کا طبقہ ایک خودداراَنہ زندگی بسر کر سکتا ہو اور وہ عوام الناس کے لیئے رحمت ثابت ہو رہا ہو مگر اُس کا دارومدار تجارتی سود پر ہو۔ غور طلب امر یہ ہو کہ آیا یہ سود جو عام طور پر بنی نوع انسان اور خاص کر غربا کے لیئے سراسر مفید ثابت ہوا ہو اُس ربوا کے تحت میں آتا ہو جس کی نسبت خداوند تعالیٰ نے اپنے عاجز بندوں کو ان الفاظ میں لڑائی کا چیلنج دیا ہو فَاْذَنُوا

بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِہٖ"؟

۱۶۔ خداوند تعالیٰ کے ساتھ لڑائی اور دوسری تعزیرات کے خوف سے مسلمان ربوا اور تجارتی سود اور ہر قسم کے سود سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تاہم وہ اُن لوگوں کے مقابلہ میں جو تجارتی سود سے نہیں بچتے اس دنیا میں زیادہ پریشان حال اور مفلس ہیں۔ مردم شماری کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں گداگروں، مجرموں اور کسبیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ ان میں باہمی تنقیص اور تنازعات زیادہ ہیں، باہمی معاملات خراب ہیں۔ کیا ان حالات میں یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ کم سے کم اس دنیا میں خداوند تعالیٰ بمقابلہ دیگر اقوام کے مسلمانوں سے اسی طرح ناراض ہے جیسے کہ کسی زمانہ میں یہودیوں سے ناراض سمجھا جاتا تھا جب کہ وہ دنیا میں ذلیل و خوار اور برباد تھے اور غیر منقولہ جائداد سے بے دخل ہو کر پریشان حال پھرتے تھے؟

۱۷۔ دنیا کے دیگر مذاہب رہبانیت کو نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسلام نے رہبانیت کو مٹا کر مسلمانوں کو حکم دیا "كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ" اور خداوند تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد فرمایا "يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ" یعنی یہ کہ آپ سخت احکام کے بوجھ جو اُن لوگوں کے سروں پر لدے ہوئے تھے اور بندھن جو اُن پر پڑے ہوئے تھے اُن پر سے دور کرتے ہیں اور آنحضرت صلعم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا "اِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ لَمْ

تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ" یعنی تم آسانیاں بڑھانے کے لیئے دُنیا میں بھیجے
گئے ہو دشواریاں بڑھانے کے لیئے نہیں ، برخلاف اس کے اب ہم علانیہ
دیکھتے ہیں کہ تجارتی سود کے غلبہ سے مسلمانوں کے لیئے تجارت کی ،
صنعت وحرفت کی ، ہر قسم کی معاش کی ، حتی کہ زندگی کی تمام راہیں بند
ہو رہی ہیں کیا اسلام کی موجودہ شکل میں یہ دعویٰ بجا طور پر کیا جا سکتا ہے
کہ "اسلام رہبانیت مٹانے والا ہے یا یہ کہ وہ سہل ہے اور سخت احکام کے
وجہ سے وہ انسانوں کو ہلکا کرتا ہے اور ان کی گردنوں سے پھندے نکالتا
ہے یا یہ کہ وہ آسانیاں بڑھاتا ہے اور دشواریاں نہیں بڑھاتا "؟

۸- اہل یورپ کے نزدیک ربوا ایسا ہی بُرا سمجھا جاتا تھا جیسا کہ
مسلمانوں کے نزدیک۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ روپیہ غیر نفع آور کاموں
میں صرف ہوتا تھا۔ جب سے یورپ میں روپیہ نفع آور کاموں میں
کثرت سے لگنے لگا اور اس سے ایک جدید چیز انٹرسٹ یا تجارتی سود کے
نام سے پیدا ہو کر انسان کے لیئے سراسر مفید ثابت ہوئی تب سے مذہبی
اور یورپ کے ملکی قوانین نے اُسے ربوا سے جدا گانہ سمجھ کر جائز قرار دے لیا
اور کچھ عرصہ ہوا کہ مصر اور ٹرکی کے مسلمان علمانے بھی اس کے جائز ہونے کا
اعلان کر دیا اب سوال یہ ہے کہ ان ملکوں میں جب کہ تجارت کا روبار میں
مسلمان قدم قدم پر تجارتی سود دے کر نقصان اُٹھا رہے ہیں اور اس کی
وجہ سے تجارت ان کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے یہ امر کہاں تک درست
ہے کہ تجارتی سود کو ربوا کے تحت میں لا کر اس کا لینا جائز قرار دیا جائے؟

۱۹۔ حدیث شریف میں آیا ہے "لاربوا الّا فی النّسیئۃ" یعنی ربا النسیہ کے سوا کوئی ربا نہیں ہے اور ربا النسیہ کی نسبت امام رازی تحریر فرماتے ہیں کہ "وہ وہ معاملہ ہے جو ایام جاہلیت سے مروج تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ لوگ اس عہد پر کچھ مال دیتے تھے کہ ہر ماہ مال کی ایک معیّن مقدار (بطور سود کے) وصول کرتے رہینگے اور اصل مال پورا کا پورا رہیگا پھر جب قرضہ کی میعاد آجاتی تو قرضدار سے اصل مال کا مطالبہ کرتے تو اگر وہ دینے سے معذور ہوتا تو قرض اور میعاد دونوں کو بڑھا دیتے" ظاہر ہے کہ اس قسم کے ربا کا اس زمانہ میں وجود نہیں ہے اسی طرح اعلام الموقعین میں تحریر ہے کہ

"ظاہری ربا ربا النسیہ ہے جو ایام جاہلیت میں مروّج تھا کہ جب قرضدار ادائے قرض میں تاخیر کرتا تو قرضخواہ کے لیے مال بڑھا دیتا اور جوں جوں تاخیر کرتا اسی طرح مال بڑھتا جاتا یہاں تک کہ ایک سو کی رقم ہزاروں تک پہونچ جاتی اور غالباً اس معاملہ پر وہی لوگ مجبور ہوتے تھے جو نادار اور محتاج ہوتے تھے پس جب قرضخواہ مناسب دیکھتا تو اپنے مطالبہ میں تاخیر کرتا جس کے عوض قرضدار اس کو اس کی زیادتی ادا کرتا تھا کہ مطالبہ اور حبس کی قید سے خلاصی پاتا رہے"

برخلاف اس کے تجارتی سود وہ ہے جو فریقین کے نفع کے لیے دیا جاتا ہے جیسے ملک کے سیراب کرنے کے لیے سلطنت اپنی رعایا سے قرض لیتی ہے اور نہر کی آمدنی سے ایک معیّن حصّہ روپیہ والے کو دیدیتی ہے

جس سے ملک سرسبز ہوتا ہے اور قرض دینے والوں کا اثاثہ بڑھتا ہے یا ایک شخص دوسرے کو معین منافع پر تجارت کرنے کے لیئے روپیہ دیتا ہے جس کے نفع سے فریقین مستفید ہوتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ ربوا النسیہ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے آیا وہ کسی طرح تجارتی سود پر صادق آتی ہے اور آیا تجارتی سود کو کسی طرح ربوا النسیہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

۲۰- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ربوا باوجودیکہ نص صریح سے حرام قطعی ہے تا ہم "لا ربوا بین المسلم والحربی فی دار الحرب" کی رو سے بعض فقہائے اسلام نے ربوا کے لین دین کو غیر مسلموں کے ساتھ جائز قرار دے دیا؟

۲۱- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض فقہائے اسلام نے ربوا کے لین دین کو چند حیلوں کے اختیار کرنے کے ذریعہ سے جائز قرار دیا ہے مثلاً یہ کہ ایکسو روپیہ کے نوٹ ادھار دے کر کچھ عرصہ بعد ایک سو پانچ لے لیئے جائیں یا ایک سو روپیہ کو رومال میں باندھ کر ایک سال کے وعدے پر انھیں ایک سو دس روپیہ میں فروخت کیا جائے؟

۲۲- آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ زیور وغیرہ کے لیئے چاندی خریدنی ہو تو اس کی نسبت حکم ہے کہ وہ روپیہ کے ہم وزن لی جائے ورنہ ربوا ہو جاتا ہے ربوا سے بچنے کے لیئے یہ تدبیر بتائی گئی ہے کہ روپیہ کے ساتھ کچھ پیسے شامل کر دیئے جائیں "تاکہ بدلین غیر جنس ہو جائیں اور یہ معاملہ ربوا نہ رہے۔

اگر ربوا فی الواقع انسان کے لیئے نقصان دہ ہے اور اس لیئے مذہباً ممنوع ہے

تو سوال یہ ہے کہ آیا تانبے کے پیسے شامل کر دینے سے اس معاملہ کی واقعی مضرت اور معصیت میں کوئی کمی آجاتی ہے؟

۴۳۔ جیسا کہ مندرجہ بالا طریقے سے چاندی خریدنے میں بظاہر ربا کی مضرت بجنسہ قایم رہتی ہے اور محض پیسے ملانے سے اس کی معصیت دور ہو سکتی ہے اور برخلاف اس کے تجارتی سود کے لین دین میں کوئی خاص مضرت موجود نہیں ہوتی اور وہ سراسر انسانوں کے لیئے مفید ہے تو سوال یہ ہے کہ آیا تجارتی سود کو ربوا کے حکم میں سمجھ کر اس کی معصیت کو دور کرنے کے لیئے کوئی ایسا حیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے جیسا کہ چاندی اور گوٹہ اور ٹیکہ خریدنے کے لیئے کیا جا سکتا ہے؟

۴۴۔ مردہ جانور اور خون اور غیر اللہ کے لیئے نامزد شدہ جانور اور لحم الخنزیر بنص صریح سے قطعی حرام ہیں اسی طرح شراب بھی قطعی حرام ہے اور خانہ کعبہ کے پاس قتل کرنا حرام ہے آیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اول الذکر اشیائ کا کھانا اضطراری حالت میں جائز ہے اسی طرح مرض کی حالت میں جب طبیب حاذق تجویز کرے شراب کا استعمال جائز ہے اور خانہ کعبہ کے قریب اگر کفار لڑنے آئیں تو انھیں قتل کرنا جائز ہے اگر اس قدر ناپاک اور مضر چیزیں اور ناجائز افعال ضرورت کے وقت جائز ہو سکتے ہیں تو آیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کی اضطراری و مجبوری کی حالت دیکھ کر تجارتی سود کو جس کے لین دین پر اس زمانہ میں مسلمانوں کی قومی زندگی کا انحصار ہے اور جس میں ربوا کی کوئی مضرت نہیں بلکہ سراسر منفعت ہے جائز سمجھا جائے؟

(۴)

ایک مسلمان تحصیلدار اور جوتشی (افسانہ)

مہابن ضلع متھرا کے ایک برہمن کو سیر و سیاحت کا شوق تھا۔ اس مقصد کے لیئے اُس نے کچھ پانسے خرید کے ایک پوتھی بنائی اور یہ سب چیزیں کپڑوں کی ایک پوٹلی میں رکھ کر اور جوتشی بن کے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہندوستان کے لوگ ضعیف العقیدہ ہوتے ہی ہیں اب جدھر جاتا ہے لوگ اس سے اپنی قسمتوں کا حال پوچھتے ہیں۔ حال پوچھنے والے بہت مگر دینے والے کم ہیں تب بھی دو دو چار چار آنے جمع ہو کر کسی دن اُس کے پاس روپئے ہو جاتے ہیں مگر روپئے ہیں یا آنے اُس کا خرچ تین آنے روزانہ سے بڑھنے نہیں پاتا۔ ٹھہرنے کو ہر جگہ دھرم سالے سرائیں موجود ہیں۔ کچھ بے حیائی اختیار کرے تو مہینہ بھر میں نہیں تو پندرہ دن ضرور مفت کھا سکتا تھا کیونکہ اکثر دھرم سالوں اور مندروں میں سدا برت جاری رہتا ہے مگر کھانے والے کے لیئے اُن کا بھوجن کشٹ ہے اس لیئے وہ پاؤ بھر آٹا لیکر خود پکا لیتا ہے اور پکانے کا وقت نہ ہو تو پکے کھانے کی دوکان سے ایک آنہ میں روٹی اور ترکاری لے کر پیٹ بھر لیتا ہے اور ہر مہینے بال بچوں کے لیئے پندرہ بیس روپئے گھر بھیجتا رہتا ہے۔ تجربہ سے اُسے معلوم ہوا کہ گاؤں والوں کے مقابلہ میں تحصیل تھانہ میں اس کی زیادہ تر

پوچھا ہی کیونکہ ان لوگوں کو زیادہ آمدنی کے ساتھ زیادہ ہوس اور زیادہ خطرہ رہتا ہی اور پھر مسلمان اہلکاروں میں اور بھی زیادہ قدر ہی جن کے پاس کھانے پینے کے بعد کچھ بچتا ہی نہیں اور وہ ہر وقت اس کے متمنی رہتے ہیں کہ پردۂ غیب سے اُن کی مدد ہو پس مسلمانوں کی اس کمزوری کو دیکھکر وہ ہر تحصیل اور تھانہ میں سیدھا مسلمان اہلکاروں کی طرف رُخ کرتا ہی۔

اتفاق سے وہ ایک دن پھرتا پھراتا جسونت نگر کی تحصیل میں جا نکلا جہاں مرزا شاہرخ بیگ صاحب تحصیلدار تھے بڑے خاندانی اور پشتینی امیر تھے مگر جائداد سب زیر بار قرضہ تھی تب بھی تحصیلداری کی آمدنی کیا کم تھی بال بچے ساتھ تھے اور بڑے عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے تھے جب یہہ جوتشی پہونچا تو تحصیلدار صاحب بنگلہ میں بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے اور اہلکار اپنے اپنے صیغہ کے احکام لیتے جاتے تھے جوتشی کی ہمت وہاں جانے کی نہ ہوتی تھی اور جب حوصلہ کر کے آگے بڑھتا تو اردلی ڈانٹ کر اُسے پیچھے ہٹا دیتا۔ خوش قسمتی سے تحصیلدار صاحب کی نظر اُس پر جا پڑی نظر کیا تھی کیمیا اثر تھی اُسی وقت اُنھوں نے اُسے بلایا اور ڈاک سے فارغ ہو کر اس سے پوچھ گچھ شروع کی۔ جوتشی اب جو پانسہ ڈالتا ہی کیسی ہی نکلتا ہی تحصیلدار صاحب سال بھر میں ڈپٹی کلکٹر ہو جائینگے۔ ایک حساب سے بڑا بیٹا جو دو سال سے نوین میں فیل ہو چکا سو پاس ہو کر رہے گا اُدھر سے اسکول کے وقت میں نکال کھیل کر دوسرا لڑکا آرہا ہی اس کی قسمت میں فوج کی کپتانی لکھی ہی۔ غرض کہ تحصیلدار صاحب سے لیکر ڈو برس کے

بچے تک کو بڑے بڑے عہدے تقسیم ہو رہے ہیں اور تحصیلدار صاحب ہیں کہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ فوراً دس روپیہ نکال کر جوتشی کو دیتے ہیں۔ جوتشی انہیں دعائیں دیتا ہے اور کچھ اور دل خوش کن پیشین گوئیاں کرتا ہے اُس پر ایک اہلکار کو اشارہ ہوتا ہے کہ اسے عملہ میں کچھ کہہ دیا جائے اور دو چار رئیسوں کے پاس بھیجا جائے۔ اب برابر ایک ہفتہ تک جوتشی کا دورہ دورہ رہتا ہے اور وہ تحصیل سے پانچسو روپیہ لیکر دعائیں دیتا ہوا رخصت ہوتا ہے خیالی ترقیوں اور عہدوں کے ساتھ بُنے رہتے ہیں اب اُسے جو رقم ملی ہے اُسے لیکر سیدھا گھر پہونچتا ہے کسی مسلمان کو اتنی رقم ملی ہوتی تو اوّل تو احباب کی دعوتیں ہوتیں۔ علاوہ کباب اُڑتے اپنے اور بیوی بچوں کے لئے پرتکلف کپڑے سلوائے جاتے میاں کفایت شعار ہوتے تو لڑکی کی شادی کے لئے زیور اور جہیز کی تیاری میں روپیہ لگاتے اور اگر چوروں اور نقب زنوں سے بچا رہتا تو لڑکی کی رخصت کے دن میاں کی عزت آبرو برادری میں بڑھتی۔ مگر پنڈت جی حالانکہ بنئے نہیں ہیں تاہم بنیوں کے داؤگھات سے کچھ نہ کچھ واقف ہیں۔ گھر پہونچکر محلہ کے جولاہوں میں روپیہ تقسیم کرتے ہیں۔ دس روپیہ دینا کرکے بارہ مہینوں میں ایک ایک روپیہ لیکر بارہ روپیہ وصول کریں گے اور دیتے وقت دس روپیہ کی جگہ نو روپیہ بارہ آنے دیتے ہیں۔ چار آنے تحریر کے کاٹ لیتے ہیں۔ مہینے پر روپیہ وصول نہ ہوگا تو پیسے روپیہ کا سود لگے گا۔ اب جولاہے ہیں کہ اس کمی سود کو دیکھ کر لوٹے پڑتے ہیں۔ کیوں کہ بنیوں سے

جب لاتے ہیں تو وہ دس روپیہ کے ساڑھے نو دیتا ہے اور ایک پیسہ کی
جگہ تین پیسے کا سود لگاتا ہے۔ پھر یہ بھی شرط کرتا ہے کہ چھ مہینے قسط نہ ملے گی تو
مال بھی اس کے ہاتھ بیچنا پڑے گا۔ اور مال کی قیمت لگاتے وقت خوب گھٹاتا ہے
بنیوں کی ان شرطوں سے پریشان ہو کر جولاہے پنڈت جی کے پاس خوشی خوشی
آتے ہیں۔ پہلی دفعہ پنڈت جی نے چار سو روپیہ چالیس جولاہوں میں تقسیم
کر دیئے اور سو روپیہ گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیے۔ اب چالیس جولاہے ایک
روپیہ فی کس کے حساب سے ہر مہینے کے شروع میں چالیس روپیہ پنڈت جی
کو دے جاتے ہیں۔ جو دس روپیہ فی کس کے حساب چار نئے جولاہوں کو دے
دیئے جاتے ہیں۔ اگلے مہینہ چوالیس روپیہ آتے ہیں اور ہر مہینے اسی طرح
تقسیم ہوتے اور بڑھتے جاتے ہیں۔ پنڈت جی صرف مہاجن کے آرٹ میں
گشت لگاتے ہیں گھر سے دور نہیں جاتے کیونکہ تو جوتش کا کام کرتے ہیں
جس سے گھر کے خرچ میں مدد ملتی ہے۔ پابند قسطوں کا کام کرتے ہیں۔
رفتہ رفتہ مالی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے اور آٹھ دس برس بعد یہ نوبت ہوتی ہے
کہ بڑی بڑی رقموں کا لین دین شروع ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے مہاجنوں میں
پابندی کے ساتھ ٹھہرنے سے استغنا ہو جاتا ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ جس
ذات کی بدولت یہ فارغ البالی حاصل ہوئی اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔
پنڈت جی کی حیثیت اب پچاس ہزار کی ہے مگر وضع قطع وہی ہے چنانچہ
ابھی جوتشی کے سیدھے سادے لباس میں وہ ٹھیکیدار صاحب کی جستجو میں
گھر سے نکلتے ہیں کسی نے غلطی سے پنڈت جی سے کہہ دیا کہ وہ ابھی جیوتش تک

کی تحصیل میں ہیں۔ سرکار نے اُن کی خاص خدمات کے صلہ میں وہاں سے بدلہ
نہیں۔ مگر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ پارسال اُن کا انتقال وہیں ہو گیا۔ اور
جن کے چشم ابرو کے اشارے پر پنڈت جی نہال ہو گئے تھے۔ خود جب
اُن کا انتقال ہوتا ہے تو بال بچوں کو جسونت نگر سے جانا مشکل ہو جاتا ہے
بازار میں ہر طرف قرض تھا بڑا لڑکا اس قابل نہ ہوا کہ چار پیسے کماتا۔ جن پر
سیکڑوں روپیہ خرچ کر لئے سیکھے تھے اور روپیہ بچا کر بڑھانے کی کوئی
تعلیم نہ ہوئی تھی۔ البتہ ایک لڑکا گورکھپور میں کلرک ہو گیا تھا وہ اس
قابل نہ تھا کہ اتنے بڑے کنبے کا بار اُٹھاتا۔ بچوں میں سے کسی کا تعلیمی بیمہ
نہ ہوا تھا جس سے اسکول میں پڑھنے والوں کی تعلیم جاری رہتی نہ تحصیلدار
صاحب کی زندگی کا بیمہ ہوا تھا جس سے بیوی کو کچھ کل رہتا۔ غرض کہ
لوگوں کے شرم و لحاظ سے اور تحصیلدار صاحب مرحوم کے حسن اخلاق
کی وجہ سے بمشکل تمام قرض ادا ہوا بہتوں سے وعدہ وعید ہو کر پیچھا چھٹا اور
بال بچے گھر پہنچ گئے۔ یہ حال سن کر جوشی تارادت زار زار روتا تھا اور کہتا جاتا
تھا کہ تحصیلدار صاحب کی قسمت میں جتنی کمائی لکھی تھی بھگوان نے اُس سے
کم نہیں بلکہ زیادہ ہی دی۔ مگر وہ اس کا رکھنا اور بڑھانا نہ جانیں تو اس کا
کیا علاج ہے میاں لوگ تو اپنی قسمت سے لڑتے ہیں اور روتے پھر اکر
چھوڑتے ہیں۔ مجھے تو تحصیلدار صاحب کی کرپا سے ایک ہی رقم ملی پائی
تھی اس کی بدولت اب کئی پشتوں تک کا سہارا ہو گیا پا[illegible]
اکثر کار کے دشمن رہے تھے جو اس جوتشی کو ان دنوں سے جانتے تھے

جب تحصیل میں اس کے واسطے روپیہ جمع کرا دیا تھا۔ بے اختیار کہنے لگے۔
"مگر شیطان تو نے سود لیکر بڑھایا۔ ایسے روپیہ بڑھانے
پر لعنت!!"

جوتشی جی "سرکار! جس کام پر لعنت ہوتی ہے وہ کام میں نے نہیں کیا۔ آخر ہماری بھی منو سمرتی میں لکھا ہے کہ سود کھانے والے کا اناج پاخانہ ہی میں بنیوں والا سود نہیں کھاتا ہوں کہ غریبوں کا خون چوس لوں میں تو صرف کاریگروں کو اتنے سود پر روپیہ دیتا تھا جس سے ان کا کاروبار چلتا رہے کبھی کسی کو نہیں ستایا کسی کا مال نہیں لیا۔ اب جب سے میں نے غلہ کی تجارت کرنے والوں کو منڈی میں سود پر روپیہ دیا ہے تب سے جولاہے روتے ہیں اور میری خوشامد کرتے ہیں۔ کیوں کہ انھیں بنئے ستاتے ہیں میاں صاحب ایسے سود کی جیسا میں تجارت کرنے والوں سے لے رہا ہوں جو سو روپیہ سے بیس روپیہ پیدا کرکے دس روپیہ مجھے دیتے ہیں اور دس خود رکھتے ہیں اس کی مناہی تو اللہ نے بھی نہ کی ہوگی اور اگر کی بھی ہوگی تو ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں میرا سود کا روپیہ اس روپیہ سے تو برا نہ ہوگا جو حضور لوگ تحصیل میں حق کے نام سے لیتے ہیں۔ اس پر میاں صاحب بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے اور پنڈت جی کو کچھ جواب نہیں دیا۔ پاس والوں نے سنا کہ وہ یہ کہتے جا رہے تھے

"کہیں اس شیطان نے رسالہ جواز سود مع فتاویٰ کا مضمون تو
نہیں سن لیا جو ہمیں قائل معقول کرتا ہے!!"

(۵)
تعلیمی بیمہ

اس زمانہ میں کم و بیش ہر شخص کی خواہش یہ ہے کہ اس کی اولاد تعلیم یافتہ ہو بالخصوص اس وجہ سے کہ آجکل معاش کا دارومدار تعلیم پر ہے۔ ہندوستان میں تعلیم ہمیشہ سے مفت تھی۔ امیر غریب کسی کو بھی تعلیم کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی نہ صرف یہ کہ تعلیم کی فیس نہ لی جاتی تھی بلکہ درسگاہوں کی طرف سے طلبا کو کتابیں اور کھانا اور مکان ملتے تھے اب امیر ہو یا غریب ہر شخص کو ان سب چیزوں کے لیئے روپیہ بہم پہونچانا پڑتا ہے۔ خواہ وہ اپنے پاس سے کرے، یا قرض لے یا بھیک مانگے۔ ظاہر ہے کہ غربا کے لیئے اس قسم کے اخراجات بہم پہونچانے نہایت مشکل ہیں مگر اسی کے ساتھ خوش حال لوگوں کو بھی چوں کہ اس قسم کے اصراف کی عادت نہیں اس لیئے وہ ناگوار ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ بالخصوص دیگر ممالک کو تعلیم کے لیئے بچوں کو بھیجنے میں جو غیر معمولی اخراجات پڑتے ہیں اُن کا متحمل ہونا ہر شخص کا کام نہیں۔

طلبا کی اس قسم کی مشکلات دیکھ کر بعض انجمنوں نے یہ انتظام کیا ہے کہ طلبا کو تعلیم کے لیئے قرض حسنہ یا وظیفہ دیتی ہیں مگر چند انجمنیں ہزاروں ضرورتمند طلبا کی جملہ ضروریات کی کہاں تک کفیل ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں لڑکے تعلیم کے لیئے پریشان پھرتے ہیں۔ ہمیں یہ خیال ہوا کہ

جس طریقے سے انسان کی زندگی کا بیمہ ہوتا ہے اسی طرح سے بچوں کی تعلیم کا بیمہ بھی عجب نہیں کہ ہوتا ہو۔ چنانچہ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ چند کمپنیوں نے اس کا انتظام کیا ہے۔

بعض اصحاب ممکن ہے کہ بیمہ کو جوا سمجھتے ہوں مگر ہم یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اول تو بیمہ بجائے خود مسلمانوں کی ایجاد ہے جب کہ وہ اسپین میں تجارت کرتے تھے اس کے علاوہ جوا وہ ہے جو غیر یقینی ہو۔ حالانکہ انسان کی انفرادی زندگی جس قدر غیر یقینی ہے ویسے ہی اس کی اجتماعی زندگی یقینی ہے۔ مثلاً یہ کہ صدیوں کی اموات کا حساب لگانے سے معلوم ہوا ہے کہ چالیس سال کی عمر کے دس ہزار اشخاص میں سے ایک سو آدمیوں کے قریب ایک سال کے اندر مرتے ہیں اس حساب سے دس ہزار آدمی ایک ایک سو روپیہ کا بیمہ کرائیں تو ہر ایک کو ایک ایک روپیہ دینا چاہیئے تاکہ اس سال مرنے والے ایک سو آدمیوں کے ورثا کو سو سو روپیہ مل جائیں۔ اسی اصول پر تعلیمی بیمہ رکھا گیا ہے جس کی بنا پر بیمہ کرنے والے اور بیمہ کرانے والے کو فائدہ رہتا ہے۔

مثلاً ایک شخص جس کی عمر پینتیس سال ہے چاہتا ہے کہ اس کے ایک سالہ بچے کو سولہ سال کی عمر ہونے پر کالج کی تعلیم کے لیئے کافی روپیہ ملتا رہے اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے بچہ کا دو ہزار کا بیمہ کرائے اس کے لیئے اسے چھیانوے روپیہ سال یا صرف آٹھ روپیہ مہینہ کے حساب سے دینے پڑینگے اس قدر دینے پر اس کے بچے کو پانچ سال تک چار سو روپیہ سال یعنی بتیس روپیہ

ماہوار ملیں گے جو کالج کی تعلیم کے لیے بالکل کافی ہیں۔ اس طریقہ میں ۱۵ سال میں کل ساڑھے پندرہ سو روپیہ کے قریب دیئے جائیں گے اور دو ہزار روپے بچے کو ملیں گے اور اگر بیمہ کرانے والا ایک یا چند اقساط دینے کے بعد مرجائے تب بھی لڑکے کو اسی قدر روپیہ ملے گا اور اگر بچہ مرجائے تو ایک قسط منہا کرنے کے بعد کل روپیہ سرپرست کو مل جائے گا یا دوسرے بچے کے نام منتقل ہوجائے گا۔

اکثر خوش حال لوگ سمجھتے ہیں کہ انھیں اپنے بچوں کا بیمہ کرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر اکثر دیکھا گیا ہے کہ خوش حال لوگوں کے انتقال کے بعد ایسی پیچیدگیاں پڑجاتی ہیں کہ اُن کے بچوں کی تعلیم رک جاتی ہے۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ نقد روپیہ کسی ایک وارث کے قبضے میں آجاتا ہے۔ کبھی جائداد کو کوئی شخص دبا بیٹھتا ہے اور بچوں کو اُن کا حصّہ نہیں مل سکتا۔ مگر جن بچوں کا تعلیمی بیمہ ہوجاتا ہے انھیں اس کی کوئی پروا نہیں رہتی کہ اُن کا ولی انھیں خرچ دے تب ہی اُن کی تعلیم جاری رہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق اپنے بچوں کا تعلیمی بیمہ کرائے۔ آئندہ کسی اشاعت میں تعلیمی بیمہ کی زیادہ تفصیل بیان کی جائے گی۔

جون ۱۹۲۵ء

---

(۶)

بنک سے سود وصول نہ کرنا

ہدم ارکانِ شریعت ہے

جمعیۃ العلماء ہند کے مقتدر اخبار جمعیۃ دہلی کے ۲ مئی ۱۹۲۵ء کے نمبر میں بنک کے سود کے بارہ میں معزز ایڈیٹر صاحب کا حسب ذیل نوٹ تحریر ہے۔

۱۸ مارچ کو کونسل آف اسٹیٹ میں سیٹھ ہارون جعفر صاحب نے ایک رزولیوشن پیش کیا تھا جس کا مدعا یہ تھا کہ سیونگ بنکوں اور حکومت کی ضمانتوں کے سرمایہ کا جتنا سود جمع ہوتا ہے اس کو کسی اور مصرف میں صرف کرنے کے بجائے مسلمان طلبا کو تعلیمی وظائف دے کر انھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھیج دیا جائے۔ حکومت نے اس مطالبہ کو اصولاً تسلیم کر لیا، مگر مصرف کے متعلق جواب دیا کہ اگر مسلمانوں کی کثرت اس خیال کی حمایت کرے گی تو اس روپیہ کو اسی کام میں صرف کر دیا جائے گا چنانچہ سیٹھ صاحب کی تجویز کو کونسل کے آئندہ گرمائی اجلاس کے لئے ملتوی کر دیا گیا تاکہ اس وقت تک اسلامی رائے عامہ کی کافی تحقیق ہو جائے۔

جب سے ہندوستان میں بنک قائم ہوئے ہیں یہ مسئلہ علمائے اسلام

کے زیر غور ہے کہ آیا بنک کا سود ربوا کی تعریف میں آتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ علمائے مصر نے اس کو جائز ثابت کرنے کی بہت کوشش کی ہے لیکن علما کی اکثریت بلکہ سواد اعظم کا مسلک ابھی تک یہی ہے کہ بنک کا سود ربوا ہے اور اس کا لینا حرام۔

اس فتوے کی بنا پر اکثر دیندار مسلمان بنک سے سود نہیں لیتے اور خصوصاً اسلامی اوقاف کا جتنا روپیہ بنکوں میں داخل کیا جاتا ہے اس پر کوئی سود نہیں لیا جاتا لیکن اس میں ایک اور قباحت ہے جو سود لینے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ قواعد کی رو سے ہر بنک مجبور ہے کہ وہ تمام جمع شدہ سرمایہ پر ایک خاص شرح کے مطابق سود الگ کر دیا کرے اور اگر صاحب سرمایہ اس کو لینے سے انکار کر دے اور اس کا کوئی اور مصرف نہ بتائے تو اس وضع کردہ رقم کو سالویشن آرمی (ملکی فوج) کے فنڈ میں داخل کر دے۔ اس قاعدے کے مطابق مسلمانوں کے سرمایہ کا منافع ایک کثیر مقدار میں ہر سال اس جماعت کو مل جاتا ہے اور وہ اس سے مسیحیت کی تبلیغ کرتی ہے۔

ایسی حالت میں شریعت اسلامی کا فتوےٰ یہ ہے کہ اگر بنکوں میں سرمایہ جمع کرانا ناگزیر ہی ہو تو اس کا سود وصول کر لینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے کیونکہ سود لینے سے بدرجہا بڑھی بات یہ ہے کہ ہم اپنے روپیہ سے کفر کی اشاعت میں مدد دیں لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس روپیہ کو اپنی ذات پر صرف نہ کیا جائے۔ بلکہ اسے صدقہ کر دیا جائے

اس بات میں فقہا کی صاف تصریح ہے کہ ان الخبیث واجب التصدق فلا یاخذ الامن یجوز له اخذ الصدقة یعنی مال حرام کو صدقہ کر دینا ضروری ہے

اور وہ صرف ایسے ہی شخص کو دینا چاہیئے جس کے لیئے صدقہ لینا جائز ہو۔ پس اس تصریح کے مطابق تمام وہ امور خیر جن میں صدقہ صرف کیا جا سکتا ہے۔ بنک کے سود کے مصرف صحیح بن سکتے ہیں۔ مثلاً فقرا و مساکین کی اعانت، یتامیٰ کی پرورش، نادار طلبا کی امداد اور تبلیغ و حفاظت اسلام وغیرہ۔

سیٹھ ہارون جعفر صاحب کا رزولیوشن بھی شریعت کے اس حکم کے مطابق بالکل درست ہے اور طلبا کی امداد و اعانت اس صدقہ کا بہترین مصرف ہے۔ لیکن اس کے لیئے صرف علی گڑھ یونیورسٹی کی تخصیص کرنے سے بہتر صورت یہ ہے کہ اس روپیہ کو تمام صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ادبی تعلیم پر صرف کرنے کے بجائے مختلف قسم کی صنعتی تعلیموں پر صرف کیا جائے مثال کے طور پر جب یہ معلوم ہو جائے کہ ہر سال کتنی رقم اس مد میں جمع ہوتی ہے تو اس کے بعد ایک خاص تعداد مقرر کر دی جائے کہ اتنے طلبا کو فن زراعت کی تعلیم دی جائے گی، اتنے طلبا انجینیرنگ کے مختلف شعبوں میں بھیجے جائیں گے اور اتنے اقتصادیات یا سائنس کی تعلیم پر

مگر اس تجویز سے صرف اسی روپیہ کی حفاظت ہوتی ہے جو سیونگ بنکوں میں جمع ہوتا ہے اور دوسرے چارٹر بنکوں پر یہ قانون نافذ العمل نہیں ہوتا

ہمارے خیال میں اس امر کی ضرورت ہے کہ اس کے تحفظ کی بھی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ اور اگر اس کا کوئی باقاعدہ انتظام ممکن نہ ہو تو ہر شخص احکام شریعت کے مطابق خود ہی انفرادی طور پر جمع کردہ سرمایہ کا سود وصول کرکے اسے تبلیغ و امداد یتامیٰ وغیرہ اسلامی امور خیر پر صرف کردیا کرے۔ کیونکہ اس باب میں تساہل سے کام لینا ہدم ارکان شریعت میں حصہ لینے کا ہم معنی ہے اور اس سرمایہ سے تبلیغ مسیحیت اور ارتداد مسلمین کا جتنا فتنہ برپا ہوتا ہے اس کا سارا وبال مسلمانوں کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔"

(سود مند) جس اہم امر کی طرف اخبار حجتیہ نے توجہ دلائی ہے امید ہے کہ دیگر معزز معاصرین بھی مسلمانوں کو آمادہ کریں گے کہ وہ کم سے کم مقامی درسگاہوں اور اوقاف کا روپیہ سرکاری پرامیسری نوٹوں میں داخل کرکے روپیہ کو محفوظ اور ذرائع آمدنی کو مستقل کرلیں۔

جولائی ۱۹۲۵ء

(۷)

اقتصادی

گناہ

۱- روپیہ کو زمین میں دفن رکھکر یا بکسوں میں محفوظ رکھ کر اُسے بیکار پڑا رہنے دینا۔

ثواب

۱- جس قدر روپیہ زمین میں دفن ہے اُسے وہاں سے نکال کر معتبر بنکوں میں داخل کرنا۔ اس سے گورنمنٹ سرٹیفکیٹ

گناہ

(۲) روپیہ کو زیور میں منتقل کر کے اُس کی حفاظت کی فکروں میں پریشان رہنا اور اپنے خاندان کی جان اور آبرو خطرہ میں ڈالنا۔

(۳) روپیہ کو ایسے قیمتی کپڑوں پر صرف کرنا جو اہل ہند کی عام حالت سے بالاتر ہوں۔

(۴) روپیہ کو ایسے قیمتی کھانوں میں صرف کرنا جو اہل ہند کی عام حالت سے بالاتر ہونے کے ساتھ

ثواب

خزینہ معتبر کارخانوں میں لگانا غریب کاریگروں اور دکانداروں کو معین اور غیر معین منافع پر دے کر اُن کے کاروبار کو ترقی دینا اور ریلوں نہروں اور ملک کی ترقی کے کاموں میں لگانا۔

(۲) مستورات کو آمادہ کرنا کہ وہ اپنی خوشی سے قیمتی زیور روپیہ میں منتقل کر کے مندرجہ بالا کاموں میں لگائیں۔

(۳) جو سالانہ رقم عمدہ کپڑوں پر صرف ہوتی ہو اُس کا تخمینہ کر کے اور سادہ کپڑوں کی قیمت منہا کر کے باقیماندہ رقم مندرجہ بالا کاموں میں سال بسال لگانا۔

(۴) سادہ سے سادہ کھانا کھا کر اپنی صحت اور مالی حالت کو درست کرنا۔

گناہ	ثواب
بطی الہضم اور مضر صحت ہوں۔	
(۵) اپنے بچوں کو چاٹ کے لیے پیسے دے کر انھیں مسرف اور چٹورا بنانا۔	(۵) اپنے بچوں کو روپیہ بچانے پر انعامات دے کر انھیں کفایت شعار بنانا۔
(۶) اپنی اہلیہ کے لئے جان بیمہ نہ کرانا اور اپنے بچوں کو تعلیمی بیمہ سے محروم رکھنا جس کے بغیر پسماندگان برباد و تباہ ہو جاتے ہیں اور بعض وقت گداگری پر مجبور ہوتے ہیں۔	(۶) اپنی اہلیہ کے لیئے اپنا جان بیمہ کرانا اور ہر بچہ کا تعلیمی بیمہ کرانا۔

طفیل احمد

جولائی سنہ ۱۹۲۵ء

(۸)

انہدام سرمایہ داری

نظام سوویٹ کی تشریح

دنیا میں ہمیشہ سے کام لینے والوں اور کام کرنے والوں کے درمیان کشمکش رہی ہے۔ ابتدائی زمانہ میں جب دو قوموں میں لڑائی تھی تو وہ ایک دوسرے کے قیدیوں کو قتل کر ڈالتے تھے۔ اس لیے رحمانہ طریقہ کی یہ اصلاح ہوئی کہ قیدیوں کو زندہ رکھ کر ان سے کام لیتے تھے۔

کاشتکاری کراتے تھے اور اُن کی پیدا کی ہوئی دولت سے عیش کرتے تھے
پھر تجربہ سے معلوم ہوا کہ قیدی خوش دلی سے کام نہیں کرتے جس سے
کام عمدہ نہیں ہوتا اس لیئے غلاموں کو آزاد کر دیا گیا اور انھیں اُجرت
دے کر اُن سے بڑے بڑے کارخانوں میں کام لینے کا سلسلہ قایم
ہوا۔ اُجرت دے کر کام لینے والے بڑے بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں
جو جاہل کاریگروں کی بےعقلی سے نفع اُٹھا کر انھیں مزدوری کم
سے کم دیتے ہیں اور اپنے مال کو زیادہ سے زیادہ قیمت میں فروخت
کر کے اُس سے زندگی کے لطف اُٹھاتے ہیں کاریگروں کی یہ حالت اُن
قیدیوں سے جو قتل کر دیئے جاتے تھے یا بعد کے زمانہ میں غلام بنائے جاتے
تھے ہزار درجہ بہتر ہے کیونکہ اب انھیں بالعموم کئی کئی روپیہ روزانہ ملتے
ہیں جن سے وہ نسبتاً اچھی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تاہم اُمرا کے مقابلہ میں
چونکہ اُن کی حالت پست ہے اس لیئے بنی نوع انسان کے ہمدرد اصحاب
ان پر رحم کر کے ان کی بہتری کے لیئے مختلف تدابیر سوچتے ہیں اور
کوشش کرتے ہیں کہ اعلیٰ طبقوں میں کثیر دولت جمع ہو کر غربا کی بربادی
اور اُن کی غلامی کی موجب نہ ہو۔ اس کے لیئے ہڑتالیں ہوتی ہیں جن سے
اُجرت بڑھائی جاتی ہے۔ کام کرنے کے گھنٹے کم کیئے جاتے ہیں۔ کاریگروں
کا حصہ کارخانوں کے منافعہ میں مقرر کیا جاتا ہے اور ہزاروں قسم کی مختلف
تدبیریں غربا کو اُبھارنے کی اختیار کی جاتی ہیں۔ بعض دردمندان قوم
انجمن ہائے امداد باہمی کے ذریعہ ادنیٰ طبقہ کو اُبھار کر انھیں اتنا خوشحال

بنانا چاہتے ہیں کہ وہ بڑے سرمایہ داروں کی غلامی سے نکل جائیں اور ایک جماعت غرباء کے خیر خواہوں کی وہ ہے جس کی یہ کوشش ہے کہ سرمایہ داری کو کلیتاً توڑ کر جملہ انسانوں کو مساوی حالت پر کر دیا جائے اور جو دولت سب مل کر پیدا کریں اُسے قوم کے ہر ہر فرد میں یکساں تقسیم کر دیا جائے ان خیالات کا عملی ظہور گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں روس میں ہوا جبکہ بالشویکوں نے وہاں کی شخصی سلطنت اور سرمایہ داری کو توڑ کر سوویٹ گورنمنٹ کے نام سے ایک جداگانہ سلطنت قایم کی۔ اس گورنمنٹ نے تمام ذاتی جائدادوں اور سرمایہ اور دولت کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ وہ شخص جو کھیت میں کام کرتا ہے، وہ جو نجاری اور آہن گری کا کام کرتا ہے اور وہ شخص جو وزارت کا کام کرتا ہے سب مثل سلطنت کے ملازم کے ہیں ہر ایک کو سلطنت کی طرف سے کھانے اور کپڑے اور دیگر ضروریات کا ٹکٹ مل جاتا ہے۔ جسے دکھا کر وہ سرکاری گودام سے اپنا کھانا اور دوسری ضروریات لے آتے ہیں۔ سب کا طرز معاشرت اور تمدن ایک ہے سب کے بچوں کی پرورش اور تعلیم سلطنت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس طریقہ کے جاری کرنے کے چند روز بعد ملک میں سخت قحط پڑے وبائیں پھیلیں۔ لاکھوں آدمی ہلاک ہوگئے۔ ملک بھوکا ہو گیا۔ تمام کاروبار بند ہو گئے حتیٰ کہ بالشویکوں نے مجبور ہو کر اہل یورپ کے سرمایہ داروں سے رجوع کیا اور خوشامد کر کے اپنے ملک میں لگانے کے لئے سرمایہ حاصل کیا۔ اور اس طرح وہاں کا کام چلتا ہوا۔

اب کچھ عرصہ ہوا انگلستان کے ایوان تجارت نے سات آدمیوں کا ایک کمیشن تحقیقات کی غرض سے ملک روس میں بھیجا تھا۔ اس کمیشن کی رپورٹ کا خلاصہ اخبارات میں شایع ہو رہا ہے۔ اس رپورٹ کی نسبت اخبار لیڈر الہ آباد کے ایک نوٹ کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے جس میں بالشوزم کا تاریک پہلو دکھایا گیا ہے۔

روسی بالشویزم کا تاریک پہلو

جمہوریت روسیہ نے عوام الناس کی فارغ البالی اور مرفہ الحالی کے لیے ایک نیا دور پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئی۔ بالشویکی تجربہ سے ایسے نتایج برآمد ہوئے ہیں جن سے دوسرے ملک والوں کو اپنے یہاں اسی قسم کا نظام حکومت قایم کرنے کی ترغیب و تحریص پیدا ہو گئی ہے؟ کیا وہاں کی حکومت کو مختار کل کے اختیارات دیدینے سے ملک کی پیداوار، آزادی اور شایستگی میں اضافہ ہو گیا ہے؟

ان سوالات کا جواب یقیناً نفی میں دیا جائے گا۔

جمہوریت کی تائید اور مالداروں کے خلاف جو تحریک روس میں پھیلائی گئی ہے اس کی بابت ممبران کمیٹی تحقیقات کو معلوم ہوا کہ زمانہ قبل از جنگ کے مقابلہ میں آج کل روس کی چند مشہور و معروف مصنوعات کی تیاری کی مقدار بہت کم ہے۔ وہاں کی ریلیں برباد ہو گئی ہیں روس کے مزدوروں کی حالت ہر ایک یورپین ملک کے مزدوروں سے

بہت ادنیٰ درجہ کی ہو اور وہاں کے کسانوں کی جسمانی صفائی اور اور اخلاقی حالت یورپ کے ادنیٰ ترین طبقہ سے بھی گری ہوئی ہو اور اس میں شک نہیں کہ اُن کی حالت ہندوستانی قلی سے بھی بدتر ہو۔ وہاں کی موجودہ تمدنی حالت خاندانی زندگی کے حق میں تباہ کن ہو اخبارات کو جمہوری جماعت کے کسی فرد پر حملہ کرنے کی ممانعت ہو اور وہاں پر انفرادی سیاسی آزادی بمنزلہ نفی کے ہو۔

تجارتی اتحاد کی پالیسی کو منسوخ کرانے کے لیے روس میں بار بار ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔ پیچیدہ معاہدوں سے موجودہ جمہوریہ کا نظام ایسی حالت پر پہونچ گیا ہو جس کو جمہوریت نہیں بلکہ سرکاری برادری یا سرکاری سرمایہ داری کہنا چاہیے۔ اس وفد نے روس کی موجودہ حالت کی مکمل تحقیقات کرکے یہ مایوس کن نتائج اخذ کیئے ہیں۔

روس کے موجودہ نظام حکومت میں کوئی شخص اپنے ورثا کے لیئے ایک ہزار پونڈ یعنی پندرہ ہزار روپیہ سے زیادہ نہیں چھوڑ سکتا ہو اس لیئے وہاں پر کوئی شخص مالدار نہیں ہو سکتا اگر کوئی شخص کوشش کرکے کچھ روپیہ پس انداز کرے تو اُس کے انتقال کے بعد وہ روپیہ وہاں کی گورنمنٹ کو مل جاتا ہو۔

زمانہ ماقبل جنگ کے مقابلہ میں آج کل روس میں کوئلہ کی

پیداوار ۲٫۷ فی صد۔ سوت کی ۳۱ فی صد ڈھلے ہوئے لوہے کی ۶٫۱۶ فی صد۔ فلزات کی ۲۵ فی صد اور اونی کپڑے کی ۳۹ فی صد ہے اور دیگر اقسام کی پیداوار کی حالت بھی اسی طرح کی ہے۔ حامیان گورنمنٹ مدعی ہیں کہ جملہ مصنوعات پر گورنمنٹ کا قبضہ ہو جانے سے اُن کی پیداوار میں بے حد اضافہ ہو جائے گا لیکن روس کا تجربہ اس دلیل کی تائید نہیں کرتا۔ روس کے نظام حکومت کی خرابیوں کا اقبال کرنے پر پروفیسر مذکور کو اس طرز حکومت میں چند خوبیاں بھی نظر آتی ہیں جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

اوّل یہ کہ سرکاری نظام تمدّن پر وہاں کی گورنمنٹ مبنی ہے جس کے عملی طور پر بہت سے مزدور اور کسان معاون ہیں دوسرے وہ اتحادی نظام پر مبنی ہے جس نے کم تعداد قوموں کو پوری مذہبی اخلاقی اور سیاسی آزادی عطا کر دی ہے۔

اگرچہ روسی گورنمنٹ کی مشینری (کل) دوسری سلطنتوں سے اصولاً مختلف قسم کی ہے تاہم وہ اچھی طرح چل رہی ہے اور اگرچہ اس نے روس کی حالت کچھ بہتر نہیں کی لیکن اُس نے وہ کام کر دکھایا جس کو انجام دینے میں دنیا کا قدیم طرز حکومت قطعی ناکام رہا۔

ان عمدہ نتائج نے سب لوگوں کو بجز ایک مختصر جماعت کے اپنے حق مخالفت سے دست بردار ہونے پر آمادہ کر دیا ہے جو دیگر مقامات پر سیاسی آزادی کے لیئے ایک ضروری حق مانا جاتا ہے۔

روس کے اس سارے نظام حکومت میں ایک نہایت دلچسپ

جدّت ہی جس کا مطالعہ کرنا غیر ملکیوں کے لیئے ضروری امر ہی۔

اصل سوال یہ ہی کہ جمہوریت نے جو وعدے کیئے تھے کیا وہ پورے ہوگئے اور اس امر کے ثبوت کی کونسی معتبر شہادت ہی کہ مزدوروں اور کسانوں کی غالب تعداد سوویٹ حکومت کی دل سے حامی و معاون ہے۔

وفد نے یہ بھی بیان کیا ہی کہ گورنمنٹ کو نہ صرف اخبارات، عام جلسوں اور سیاسی مشینری پر پورا اختیار اور قابو حاصل ہی بلکہ اسکول، یونیورسٹیاں اور فوج بھی بالکل اُسی کے قبضہ میں ہیں۔ گورنمنٹ کو سرمایہ غیر ملکی قرضہ، تجارت اور مراعات پر بھی پورا اقتدار حاصل ہی۔ اس صورت میں رعایا کے حقیقی جذبات سے آگاہی حاصل کرنا بے حد دشوار امر ہی۔

اخبار لیڈر کی اس رائے کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہی کہ مسلمانوں میں سے بعض اصحاب اپنی قوم کے عام افلاس کے مرض کو مایوس العلاج سمجھ کر یہ اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ دولت مند طبقہ کے خلاف مثل روس کے کوئی ایسا زبردست انقلاب ہوگا جو دنیا سے سرمایہ داری کو نیست ونابود کرکے سب کو یکساں حالت میں کر دے گا۔ مگر جب کہ خود روس میں بعض لوگوں کے نزدیک یہ تجربہ ناکام رہا اور وہاں کی سلطنت سرمایہ داروں کی امداد لینے پر مجبور ہوئی یا خود سلطنت سرمایہ دار بنکر وہاں کی رعایا سے مثل غلاموں کے کام لینے لگی تو اس امر کی کیا اُمید ہی کہ

اس زمانہ میں کوئی قوم بغیر سرمایہ کے زندہ رہ سکتی ہے خواہ وہ چند افراد
کا سرمایہ ہو یا سلطنت کا۔

روسی بالشویزم کا روشن پہلو

اگرچہ اخبار لیڈرس نے روسی بالشویزم کا
زیادہ تر تاریک پہلو دکھایا ہے تاہم یہ ناانصافی ہوگی اگر اس تحریک کا
روشن پہلو نہ دکھایا جائے۔ اس کے لیئے ہمیں اصل رپورٹ کی طرف
رجوع کرنا پڑے گا جس میں تحریر ہے کہ "وہاں کاریگر کو جو مزدوری دی جاتی
ہے وہ ایسی ضروریات کے لیئے ہوتی ہے جو نقد روپیہ سے فراہم کی جاتی ہیں۔
باقیماندہ ضروریات مثل تفریح، سفر، علاج، بیمہ حیات، کرایہ مکان اور
بچوں کی پرورش کے یہ سب چیزیں سلطنت کی طرف سے فراہم کی
جاتی ہیں"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کی طرف سے وہاں
کے مزدوروں کو ضروریات زندگی کے لیئے نقد ملتا ہے اس کے علاوہ
بہت سے تفریح کے سامان فراہم کیئے جاتے ہیں، انھیں تعطیلوں میں
سفر کرنے کا خرچ دیا جاتا ہے اُن کی زندگی کا بیمہ کرایا جاتا ہے بچوں کی پرورش
کی جاتی ہے اور ان سب اخراجات کی کفیل سلطنت ہوتی ہے اور سلطنت
اہل یورپ سے سرمایہ قرض لے کر روپیہ پیدا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے وہ کونسی تجویز ہے جس کے
ذریعہ وہ افراد قوم کو اس قابل کردیں کہ وہ اپنے کھانے پینے کے سامان
بچوں کی پرداخت اور تعلیم بیماری کے علاج، اور مرنے کے بعد بیمہ کے

ذریعہ اپنے پسماندگان کی پرورش کے افکار سے مستغنی ہو جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس قدر تحریکیں دُنیا میں جاری ہیں اُن کی انتہائی غایت یہی ہے کہ جملہ طبقات قوم کم و بیش یکساں خوشحال ہوں۔ نہ کہ مثل مسلمانوں کے غریب سے لیکر امیر تک، کاریگر سے لیکر کارخانہ دار تک، بساطی سے لیکر ملک التجار تک اور ادنیٰ زمینداری سے لیکر بڑی سے بڑی سلطنت تک سب مقروض اور دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام اور پریشان حال ہوں۔ ذاتی طور پر ہم نہ سرمایہ داری کے دلدادہ ہیں اور نہ بالشویزم کے مخالف۔ ہمارا مقصود تو صرف مسلمانوں کو افلاس و گداگری کی خندق سے نکالنا ہے اور اُس کی تدبیر یہ ہے کہ ہر فرد روپیہ کو بچانا اور بڑھانا سیکھے، انجمنہائے امداد باہمی میں شریک ہو، ملک کے کاروبار اور صنعت و تجارت میں حصہ لیکر ایک خود دارانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بنے اور بس

---

(۹)

ہندوستان میں بہت سے بنکوں کی ضرورت

لاہور میں (People's Bank of Northern India) یعنی بنک باشندگان شمالی ہند کے افتتاح کی رسم ادا کرنے کا ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں ہر طبقہ کے ہندو مسلمان اور سکھ شریک تھے اس جلسہ میں آنریبل لالہ ہرکشن لال صاحب نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

بنگال بمبئی اور مدراس کے تین پریسیڈینسی بنکوں کو ملا کر ۱۹۲۱ء میں
امپیریل بنک قایم کیا گیا۔ امپیریل بنک کے علاوہ اس ملک میں اٹھارہ
اکسچینج یعنی تبادلہ کے بنک کام کر رہے ہیں جن کے دفاتر ہندوستان
سے باہر ہیں اور ان کے علاوہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مشترکہ
سرمایہ کے چھبیس بنک درجہ الف کے اور بیالیس بنک درجہ (ب) کے
ہیں۔ الف اور ب کلاس کے بنکوں میں مستقل اور محفوظ سرمایہ کی مقدار کا
فرق ہے جو علی الترتیب پانچ لاکھ اور ایک لاکھ ہے۔ ہندوستان میں
اس قسم کے اور بہت سے بنک ہیں لیکن وہ ایسی معمولی حیثیت کے
ہیں کہ سرکاری طور پر قابل تذکرہ یا قابل شمار نہیں ہو سکتے۔ ان بنکوں
پر پبلک کے اعتماد کا اندازہ ان رقموں سے ہو سکتا ہے جو ان میں جمع
کی جاتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ پریسیڈنسی بنک کی ۱۳۰ شاخیں
ہیں اور اس میں ۷۰ کروڑ روپیہ ہے تبادلہ کے بنکوں میں ۲۸٫۵ کروڑ ہندوستانی
مشترکہ سرمایہ کے الف کلاس کے بنکوں میں ۴۳٫۵ کروڑ اور درجہ ب
کے بنکوں میں ۳٫۲۵ کروڑ روپیہ ہر سال جمع کیا جاتا ہے۔

درجہ ب کے بنکوں کے مالک اور منتظم صرف ہندوستانی ہیں
لیکن درجہ الف کے بنکوں کا انتظام یورپین اور ہندوستانیوں دونوں
کے ہاتھوں میں مشترکہ طور پر ہے۔ ان بنکوں میں منجملہ دو ارب روپیہ کے
خالص ہندوستانی سرمایہ ۲۶ کروڑ روپیہ ہے۔ یہ دو ارب کا سرمایہ
بھی زمانہ حال کے یورپین اور نو آبادیوں کے بنکوں کے سرمایہ کے

مقابلہ میں بہت حقیر رقم ہے۔

مصدقہ اعداد سے معلوم ہوا ہے کہ دیگر ملکوں میں ایک ایک بنک کی سولہ سولہ شاخیں ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کا مستقل سرمایہ علاوہ دیگر آمدنیوں کے ساٹھ کروڑ پونڈ یعنی نو ارب روپیہ ہے۔

ہندوستان میں پینتیس ہزار میل ریلوے ہے۔ کئی ہزار میل بحری راستہ ہے اور ۳۰ کروڑ کی آبادی ہے اس لحاظ سے یہاں پر بنک برائے نام ہیں ۱۹۲۵ء نہایت خوش اقبالی کا سال ہے جب کہ ہم درخواست کرتے ہیں کہ بنکوں کی تعداد میں ایک اور بنک کا اضافہ فرمادیا جائے۔

لالہ ہرکشن لال صاحب کی مرقومہ بالا تقریر کی طرف ہم مسلمانوں کو خاص طور پر توجہ دلاتے ہیں کہ وہ اسلامی بنک زیادہ تعداد میں کھولنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ آج کل دُنیا کی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کا انحصار صرف بنکوں ہی کے قیام پر ہے اور اس وقت بھی ہندوستان میں جو تھوڑی بہت تجارت اور صنعت و حرفت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اُس سے حقیقی نفع وہ اُسی وقت اُٹھا سکتے ہیں جب وہ دیگر قوم کے سرمایہ داروں کی غلامی سے آزادی حاصل کریں اور یہ صرف اُسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب کہ زیادہ تعداد میں مسلمان اپنے بنک قایم کریں۔

جولائی ۱۹۲۵ء

(۱۰)

امانت میں خیانت

قصبہ فیض نگر میں حافظ محمد امین ایک بڑے متقی، پرہیزگار، تہجد گزار بزرگ رہتے ہیں۔ بادشاہی زمانہ سے ان کے خاندان کی بڑی آبرو ہے، ان کی ایمانداری اور دیانت داری کی دھاک آس پاس کے قصبات اور دیہات میں بیٹھی ہے۔ غریب غربا کے پاس چار پیسے بچ جاتے ہیں تو انھیں کپڑے کی پوٹلی میں باندھ کر حافظ جی کے پاس رکھ جاتے ہیں تاکہ بچوں کی شادی بیاہ میں کام آئیں اور یہ پوٹلیاں برسوں بجنسہ رکھی رہتی ہیں مجال نہیں کہ انھیں کوئی چھو بھی سکے۔ حافظ صاحب کی ذات سے قصبہ والوں کو بڑا آرام ہے۔ غریب آدمی کے گھر میں روپیہ رکھا ہو تو چور چکار چھپنوں پر چڑھے پھرتے ہیں۔ کوئل لگاتے ہیں۔ راتوں کو سونے نہیں دیتے حافظ جی امیر آدمی ہیں اُن کے ہاں پہرہ کا انتظام ہے اور سب کو اُن پر اطمینان ہے۔

اُن کا بیٹا محمد مبین بھی نیک اور لائق ہے، اُسے تجارت کا شوق ہے۔ فصل پر غلہ بھر لیتا ہے اور لوگوں کے ہاتھ بیچتا رہتا ہے۔ مگر بازار میں غلہ کی کمی ہو تو روک کر نہیں رکھتا کیونکہ حافظ جی نے غلہ کی تجارت کی اسی شرط پر اجازت دی ہے کہ اُسے روک کر نہ رکھا جائے بلکہ بازار کے بھاؤ پر بیچتا رہے۔

حافظ جی کو بھی اُس کی دیانت پر اطمینان ہے اور جب سے وہ ضعیف ہو گئے ہیں امانت کے صندوق کی کنجی بھی اسی کے سپرد کر دی ہے۔ محمد مبین بڑا

متواضع اور ملنسار ہی۔ اُس کے احباب کا دائرہ وسیع ہی۔ قصبہ کی عربی مدرسہ کی امانت بھی اُسی کے پاس ہی اور علما کا ذاتی روپیہ بھی یہیں رکھا جاتا ہی جس کی وجہ سے علماء کرام کی آمد ورفت رہتی ہی۔

اب محمد مبین کی تجارت کا کام پھیلتا جاتا ہی روپیہ کی قلت ہی۔ محمد مبین اپنے پدر بزرگوار سے کہتے ہیں کہ امانت کا روپیہ تجارت میں لگانے کی اجازت دیدیں۔ اُس میں بھی وہ محفوظ رہے گا۔ خدانخواستہ اُس میں نقصان ہو تو لاکھوں روپیہ کی جائداد موجود ہی مگر حافظ جی ہیں کہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں اور امانت کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں دیتے۔ بالآخر محمد مبین سنا لاتے ہیں کہ وہاں کے عربی مدرسہ کا روپیہ بھی ایک سوداگر کے ہاں تجارت میں لگا ہوا ہی۔ ضعیف باپ بالآخر مجبور ہو کر بادل ناخواستہ اجازت دیدیتے ہیں۔ کیونکہ اُن میں بار بار اُٹھنے اور روپیہ کی دیکھ بھال کرنے کی قوت نہیں رہی بہرحال امانت کا روپیہ تجارت میں لگتا ہی۔ محمد مبین کے کاروبار کو خوب ترقی ہوتی ہی وہ مہینے دو مہینے میں دعوتیں بھی کرتے رہتے ہیں جن میں معززین اہل شہر شریک ہوتے ہیں۔ بالآخر غلہ کا کام زیادہ پھیل کر بے قابو ہو جاتا ہی۔ محمد مبین کی توجہ زیادہ تر میل جول اور حکام رسی کی طرف ہوگئی ہی۔ آنریری مجسٹریٹی کا شوق دامنگیر ہی گیہوں کی فصل اچھی ہوئی تھی پھر برسات وقت پر ہوئی غلہ کا نرخ گر گیا اور کاروبار میں کچھ تنزل ہوا جس کا پتہ کچھ مدرسہ میں چل گیا مہتمم صاحب نے علاوہ ماہواری خرچ کے امانت میں سے دو ہزار روپیہ منگا بھیجا۔ اُس کے

پہونچنے میں کچھ دیر ہوئی - اُن کی شہرت تمام قصبہ میں ہو گئی - اب کیا تھا ہر طرف سے لوگ دوڑ پڑے - اب حافظ محمد امین کے دروازے پر ایک بھیڑ ہو گئی ہو حافظ جی تو علیحدہ ایک صحن میں پڑے رہتے ہیں - یہ خبر سُنکر پھر پلنگ سے اُٹھے نہیں اور ہفتہ بھر بعد جب اُن کا جنازہ نکلا تب لوگوں نے اُنھیں دیکھ پایا - محمد یمین البتہ لوگوں کو دم دلاسہ دیتے ہیں مگر جن کے پسینے کی کمائی کا روپیہ جاتا رہے اُنھیں کیسے تسلی ہو - جو کھاتے پیتے اور کماؤ ہیں خیر وہ چُپ ہو رہے ہیں تو مضائقہ نہیں مگر وہ ضعیف بیوہ عورتیں جنھوں نے چکی پیس پیس کر پیسہ پیسہ جمع کیا تھا اور اُس کے روپیہ بنا کر حافظ جی کے بھروسہ پر اُن کے بیٹے کے سپرد کیئے تھے، کیا کریں اُن میں سے کوئی سینہ کوبی کرتی ہی، کوئی روتی اور محمد یمین کو کوستی جاتی ہی جو زیادہ سمجھدار لوگ ہیں وہ زیادہ اونچی باتیں کرتے ہیں اور اپنی غلطی پر کہ اُنھوں نے اپنا روپیہ ڈاکخانہ میں کیوں جمع نہیں کیا نادم ہوتے ہیں بہت سے بے تعلق لوگ بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں جن میں سے ایک سن رسیدہ شخص دوسرے سے کہتا ہی -

ان باتوں میں تو ہمارے مقابلہ میں ہندو ہی کھرے ہیں - ہمارے محلہ میں ایک بے حیثیت بنیہ رہتا ہی - ایک روز دیکھتا کیا ہوں ہاتھ میں ایک دستاویز لیئے کچہری کی طرف چلا جا رہا ہی - میں نے کہا آج کسے گانٹھا ہی بولا آج تو میں ہی دستاویز لکھ رہا ہوں - میں نے تعجب سے پوچھا تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہی کہ تو آج دستاویز لکھ رہا ہی - آبدیدہ ہو کر کہنے لگا

کہ میرا بڑا بھائی مول راج مر گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں۔
کل دس ہزار روپیہ میرے پاس امانت ہے اب اس روپیہ کو میں کچھ
تو اپنی دکان میں لگاؤں گا اور باقی قرض پر دونگا۔ یہ دس ہزار
روپیہ کی دستاویز میں نے بچوں کے نام لکھدی ہے جب یہ بالغ ہوں
مجھ سے مع سود کے روپیہ لے لیں۔ بنیہ نے یہ کہکر دستاویز میرے ہاتھ میں
دیدی۔ کھان صاحب! (خان صاحب) تم بھی اس پر گواہی کر دو۔ اب
میں جو دستاویز پڑھتا ہوں تو اس میں ایک روپیہ سیکڑہ کا سود لکھا ہے۔
میں نے پوچھا یہ روپیہ سیکڑہ سود تو کیسے دے گا ہم لوگ تو بارہ آنے
اور دس آنے کا سود نہیں ادا کر سکتے اور جب ایک بار دستاویز لکھدیتے
ہیں تو سمجھتے ہیں کہ وہ سب گھر بار جائداد لے ڈوبے گی۔ بنیہ بولا۔
کھان صاحب تم بڑے آدمی ہو۔ تمھارے بڑے کھرچ ہیں ہم گریب
آدمی ہیں پیسہ سے پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ کھان صاحب! اس دستاویز
میں بھی مجھے نکسان (نقصان) نہیں بلکہ نبھا (نفع) ہے آپ نے نہیں
دیکھا کہ میں نے روپیہ سیکڑہ کا سود تو لکھا ہے مگر سود در سود نہیں
لکھا۔ میں آپ ہی لوگوں کو ڈیڑھ اور دو روپیہ سیکڑہ سود در سود
پر دونگا اور اگر پورے روپیہ سیکڑہ پر بھی سود در سود کے حساب سے
دوں تب بھی نبھا ہی نبھا ہے اور زیادہ ایمانداری کی کمائی کرنا
چاہوں تو منڈی میں آڑھتیوں کو اور بیوپاریوں کو صبح کو دیدوں اور
شام تک اُن سے اچھا کھاسا (خاصہ) منا بھا (منافع) کمالوں۔ یہ

سن کر میں ششدر رہ گیا اور مسلمانوں کی بے بسی پر افسوس کرنے لگا۔"
غرض کہ محمد مبین کے دروازے کے سامنے اس قسم کی مختلف باتیں ہو رہی تھیں۔ اس اثنا میں اخبار بیچنے والا آگیا اور ایک شخص نے لکھنؤ کا اخبار ہمدم خریدا۔ پہلا صفحہ کھولا تو اس میں حسب ذیل عنوان پر ایک مضمون تھا جس کا خلاصہ درج ذیل کیا جاتا ہے، اور جو اس وقت مجمع کو پڑھ کر سنایا گیا۔

مسلمانوں کے قومی کام کیوں برباد ہیں

یہ امر واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی درسگاہیں یتیم خانے اور انجمنیں ہمیشہ روپیہ کی کمی سے خراب حالت میں رہتی ہیں اور آئے دن ان کے لیئے فراہمی سرمایہ کی اپیلیں اور عرضداشتیں شایع ہوتی رہتی ہیں وفود جاتے ہیں اور پھر بھی ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ برخلاف اس کے دیگر اقوام کے خیراتی کاموں کی تعداد اور مالی حالت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔
اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ مسلمان نسبتاً مفلس ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جو کچھ انھیں ملتا ہے اسے چونکہ بنک میں رکھ کر اس کے منافع کو استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیئے انجام کار وہ خرچ ہو کر رہتا ہے۔ بنک کا سود نہ لینے سے بڑے تاجروں کی جو بربادی ہو رہی ہے اسے یہ سمجھ کر نظرانداز کیا جا سکتا ہے کہ وہ بڑے تاجر نہ رہیں گے تو بساطخانہ کی دکان کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال لیں گے مگر قومی انجمنوں اور درسگاہوں کی بربادی کے یہ معنی ہیں کہ آئندہ کے لیئے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت سے بالکل ہاتھ دھو لیئے جائیں۔
اس سلسلہ میں سکھوں کی قوم کی مثال پیش کی جاتی ہے جن کی نسبت سنا ہے

جس مقام پر ان کی کانفرنس ہوتی ہے وہاں عام چندہ سے ایک اسکول قایم
کردیا جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ہر مقام کے لیئے دو لاکھ چندہ جمع ہوتا ہے جس میں
سے کچھ روپیہ عمارت پر صرف ہو جاتا ہے۔ اور باقیماندہ بطور مستقل سرمایہ
کے بنک میں رکھ کر اس کی آمدنی سے سالانہ خرچ چلایا جاتا ہے۔ اس طرح
ایک بار ایک مدرسہ کے لیئے سرمایہ فراہم کر دینے کے بعد پھر اس پر قوت
صرف کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس طریقہ پر اگر سلسلہ جاری رہے تو لا
تعداد مدرسے مستقل طور پر قایم ہو سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر مسلمانوں کو بھی
خدا توفیق دے کہ وہ ہر مقام پر ہر سال ایک مدرسہ کے لیئے دو لاکھ روپیہ
جمع کر دیں۔ تو اس سے پچاس ہزار عمارت میں لگانے کے بعد اگر ڈیڑھ لاکھ
کو بنک میں رکھدیں تو پانچ فی صدی سالانہ کے حساب سے ساڑھے سات
ہزار روپیہ سالانہ یا ۶۲۵ روپیہ ماہوار مستقل آمدنی ہوتی ہے جو ہمیشہ کے لیئے
ہوگی لیکن اگر اس سرمایہ کو سال بسال صرف کرتے رہیں تو صرف بیس
سال میں یہ روپیہ خرچ ہو جائے گا۔ اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ اگر
مسلمان سال بسال دو لاکھ روپیہ مدارس کے لیئے جمع کرتے رہیں
اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے تو ان کے قومی مدرسے تعداد
میں بیس سے زیادہ نہیں بڑھ سکتے کیونکہ ہر بیس سال بعد جس مدرسہ
کا سرمایہ ختم ہو چکا ہوگا پھر اس کے لیئے روپیہ جمع کرنا پڑے گا۔ حالانکہ دیگر
اقوام کے مدرسے ہزاروں لاکھوں تک پہونچ سکتے ہیں۔ اس نقص کی وجہ
سے مسلمان چند مدارس اور انجمنوں کے دائرہ میں تیل کو لھو کے بیل کے

چکر لگاتے رہتے ہیں اور ان کے مہتمموں کے ہاتھوں ہیں ہمہ وقت کاسۂ گدائی رہتا ہے جو نہ صرف مقامی لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے بلکہ تمام ملک میں شرق سے غرب تک اور جنوب سے شمال تک گشت لگاتار رہتا ہے۔ اور چونکہ قوم میں عام طور پر افلاس ہے اس لیئے بالعموم مدرسہ یا قومی کام جاری ہوتا ہے تو اس کے منتظم سیدھے کسی ریاست کا یا بمبئی کلکتہ اور رنگون کا رخ کرتے ہیں مگر چونکہ بنک کا سود نہ لینے کی وجہ سے اب وہاں بھی مسلمانوں کی تجارت گر رہی ہے۔ اس لیئے خدا نہ کرے یہ دروازہ بھی بند ہونے کا سامان ہو رہا ہے۔

خیر تاجروں کو برباد ہونے دیجئے مگر در سگاہوں کی مفلوک الحالی دور کرنے کی کوئی تدبیر کرنی ضروری ہے صرف ناجائز کا حکم لگا دینے سے اس وقت کام نہیں چلتا۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے۔ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو روپیہ چندہ میں آئے اس سے ہم جائداد خرید سکتے ہیں مگر تھوڑے سے روپیہ سے جو چندہ میں آتا ہے اس سے موقع کی جائداد ہر وقت یکجائی نہیں خریدی جا سکتی اور خریدی بھی جائے تو بالعموم وہ پانچ چھ فی صدی منافع سے کم پر نہیں ملتی جو بنک کا سود ہے۔ اور بنک سے بغیر کسی مزید صرفہ کے ہر ششماہی پر روپیہ وصول ہو جاتا ہے۔ اور جائداد کے منافع کی وصولی کے لیئے کارندے رکھنے پڑتے ہیں۔ نالشیں کرنی پڑتی ہیں جس کی وجہ سے آدھا منافع بھی پلے نہیں پڑتا۔ اگر جائدادوں سے وصول ہو سکتا تو آج مسلمانوں کو قانون اوقاف کے نفاذ کے لیئے کیوں کوشش کرنی

پڑتی۔ موقوفہ جائدادوں کی جو حالت ہے وہ قوم پر ظاہر ہے۔

قومی انجمنوں اور درسگاہوں کو اب تک یہی دقت ہے کہ جو کچھ چندہ آتا ہے وہ سب صرف ہو جاتا ہے اور پس انداز روپیہ کی حفاظت کی مصیبت سر پر رہتی ہے اگر سوداگروں کے ہاں امانت رکھاتے ہیں تو نفع سوداگر اٹھاتے ہیں۔ اور دیوالہ نکل جائے تو ٹوٹا انجمنوں۔ مدرسوں اور مساجد کے حصہ میں آتا ہے بنک میں بلا منافع کے رکھاتے ہیں۔ تو اس کے نفع سے عیسائیوں کی پرورش اور مسلمانوں کا ارتداد اور گرجوں کی تعمیریں ہوتی ہیں ان تمام مشکلات کو مولوی مفتی عزیز الرحمن صاحب دیوبندی کے فتوے نے جو ممبئی کی جامع مسجد کے سرمایہ کے سلسلہ میں اخبار الامان اور خلافت میں شایع ہوا ہے حل کر دیا جس کا منشا یہ ہے کہ بنک کا سود نیک کاموں میں صرف ہو سکتا ہے۔ پس اب ضرورت ہے کہ جلد سے جلد اس کا نفاذ کیا جائے اس فتوے کے بعد جن جماعتوں کو اپنا سرمایہ بنکوں میں جمع کر کے منافع لینے میں تامل ہوگا۔ وہ قومی نقصان کے باعث ہوں گے اور جو اپنے روپیہ کو کسی سوداگر کے پاس یا اپنے پاس رکھیں گے ان کی نسبت مخالفین کو یہ بدگمانی کرنے کا موقع ملے گا کہ وہ اس روپیہ سے ذاتی نفع اٹھاتے ہیں۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ ؀

یہ مضمون سنکر عام طور پر مسلمانوں پر اثر ہوا اور اکثروں نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنا روپیہ ڈاکخانہ یا کسی معتبر بنک میں جمع کر کر

اُن کا منافعہ لیں گے اور کیش سرٹیفکٹ خریدیں گے۔ بعض جو محتاط تھے اُنھوں نے کہا کہ ہم اپنا روپیہ ڈاکخانہ میں جمع کر کے اُس کا منافع عربی مدرسہ یا یتیم خانے میں دیدیں گے۔

جولائی ۱۹۲۵ء

---

(۱۱)

دارالسلطنت ہند میں مسلمانوں کی حالت

دہلی صدہا برس تک مسلمانوں کا دارالسلطنت رہا ہے اور آج وہ انگریزی گورنمنٹ کا بھی دارالسلطنت ہے وہ تجارت کا مرکز ہے وہاں مسلمان تاجروں کی کمی نہیں ہے۔ کثرت سے مسلمان کارگیر ہیں جن کا حصہ دولت پیدا کرنے میں کم نہیں۔ تاہم مسلمانوں کی جو حالت وہاں ہے اُس کا اندازہ جناب مولانا ... ش النجیری صاحب کی ایک چٹھی سے ہوگا جو ۲۴ مئی کے ہمدم میں شایع ہوئی ہے۔ اور جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

جناب من غدر ۱۸۵۷ء نے مسلمانان ہند کی حالت میں بالعموم اور مسلمانان دہلی کی بالخصوص جو تغیر پیدا کیا اگر چشم بینا اسے غور سے دیکھے تو خون کے آنسو گریں گے۔ اخوت اسلامی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مسلمان جو اس وقت فکر معاش سے سبکدوش ہیں اپنا پیٹ بھرنے کے بعد

اُن مسلمانوں کو دیکھنے جو دو دو دانوں کو محتاج ہیں۔ اُن بن باپ کے بچوں کو جو بھوکے مر رہے ہیں بچی کھچی روٹی میں سے ایک ٹکڑا دیدیتے ان پردہ نشین رانڈوں کا بین کے سر سے وارث اٹھ گئے اور جن کو ہر شام فاقہ کا ہیضہ مار دیتی ہے پیٹ بھر دیتے لیکن ایسا ہوتا تو آج مسلمانوں پر یہ وقت نہ آتا کہ کلمۂ توحید پڑھنے والیاں آغوش اسلام سے نکل کر ارتداد کے پھندے میں پھنستیں اور تانبے کے چند سکوں پر مذہب قربان اور عصمت برباد کر دیتیں،،

اس کے بعد ایک نہایت قدیم اور علما کے خاندان کا واقعہ لکھا ہے کہ فاقوں سے تنگ آکر ایک ضعیف بیوہ نے اپنی بچیوں کو مشنریوں کی سپردگی میں دینا منظور کر لیا تھا جسے مولانا موصوف نے بچا لیا۔

مندرجہ بالا تحریر سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔

(۱) مسلمان غدر ۱۸۵۷ء میں بُری طرح برباد ہوئے بربادی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

(۲) اگر خوش حال لوگ پردہ نشین رانڈوں اور یتیموں کو پیٹ بھر روٹی دیتے تو کلمۂ توحید پڑھنے والیاں آغوش اسلام سے نکل کر ارتداد کے پھندے میں نہ پھنستیں۔

(۳) گویا فارغ البال لوگوں کی غفلت سے غریب بیوہ عورتیں اپنا مذہب قربان اور عصمت برباد کر دیتی ہیں۔

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ یہ اس لئے کہ باوجودے کہ مسلمان تجارت

کرتے ہیں صنعت و حرفت میں جان کھپا کر خوب کماتے ہیں مگر ان کے نزدیک
روپیہ کا مصرف بجز اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ اچھا کھانا کھائیں، عمدہ کپڑے
پہنیں اور عیش پرستی کریں۔ بڑے شہروں میں جا کر دیکھیے کہ صبح صبح
حلوائیوں اور پراٹھے بیچنے والوں کی دکانوں پر لوگ گرتے ہیں؟ یہی
مسلمان، شام کو کباب قیمہ کھانے والے غول کے غول کس قوم کے
لوگ ہوتے ہیں؟ غریب مسلمانوں کے، برف کی قلفیاں کھانے والے اور
تمام دن شربت اور برف کے گلاس پینے والے کس امت کے لوگ ہوتے
ہیں؟ اوہ! امتِ محمدی کے جس کے رہبر نے پیٹ پر پتھر باندھ کر پھاوڑے
سے خندق کھودی تھی اور جو کی روٹی پر بسر کی تھی اور صحیح طور پر اپنی
قوم کو سادگی کا سبق دے کر اسے دنیا کی سب سے زبردست حکمراں
قوم بنا دیا تھا۔ اب اسی امت کے برف پینے والوں اور قلفیاں و قیمہ
اور کباب کھانے والوں کی مائیں بہنیں آئے دن، افلاس سے تنگ
آکر تبدیل مذہب پر مجبور ہوتی ہیں۔

مگر میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں کہ ان مفلس عورتوں کو اگر کچھ
مل جاتا ہے تو وہ بھی پراٹھے کباب اور حلوے کھاتی ہیں خود اپنے شوہروں
کی زندگی میں باوجود صدہا روپیہ کی آمدنی کے وہ ادنیٰ ضرورتوں کے لیے
قرض لینے کی عادی تھیں۔ آج شوق سے ایک زیور بنوایا ہے۔ آموں کی
فصل آگئی، سو روپیہ کی چیز کو تین روپیہ ڈوتے نے سیکڑہ سود پر پچاس
روپیہ میں رہن رکھ کر اس سے خوب گلچھرے اڑائے اور وہ زیور چھڑا کر

مدّت العمر نوبت نہ آئی۔ دوسری قوموں کی ہمسایہ عورتوں کو سو پچاس روپیہ مل جاتے ہیں تو انھیں مسلمان بیبیوں کو سود پر دے کر وہ اپنی زندگی عزت و آبرو سے گزار دیتی ہیں۔ عزت و آبرو عمدہ کپڑوں اور زیور اور اچھے کھانوں کی نہیں بلکہ اس بات کی کہ مدّت العمر کسی سے قرض نہیں مانگا اور دست سوال دراز نہیں کیا اور مرتے وقت کوئی دھرم سالہ یا کنواں بنوا دیا۔ آدمیوں کے لئے پیاؤ لگوا دی۔ مویشیوں کے پانی پینے کا حوض بنوا دیا۔ ایسی قوم کے لوگوں پر اگر سو بار ۱۸۵۷ء کا حادثہ گزر جائے تب بھی وہ گداگر نہیں بن سکتے کیونکہ وہ اپنے جذبات پر قادر ہیں۔ وہ دنیا میں رہنے کے طریقے جانتے ہیں۔ وہ روپیہ کے رکھنے اور بڑھانے کے فن سے واقف ہیں۔

جناب مولانا راشد الخیری صاحب نے از راہ محبت اسلامی جو تربیت گاہِ بنات قایم کی ہے جس میں وہ مفلوک الحال بچیوں کو پناہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ تمام قوم کی شکر گزاری اور امداد کے مستحق ہیں مگر با ادب ہم اس قدر عرض کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ انھیں دیگر تعلیمات کے ساتھ اپنی پناہ گزینوں کو کفایت شعاری اور روپیہ سے روپیہ پیدا کرنے کی تربیت دینی چاہیئے تاکہ قومی ترقی کی عمارت مضبوط بنیادوں پر قایم ہو۔

جولائی ۱۹۲۵ء

(۱۲)

مسلمانان جودھپور سے خطاب

انگریزی علاقہ ہو یا ہندوستانی، مسلمان کم و بیش ہر جگہ پست حالت میں ہیں ہمیں جودھپور کے بعض دردمند اصحاب سے وہاں کے کچھ حالات معلوم ہوئے ہیں جو بالخصوص ریاست مذکور کے مسلمانوں کے لیئے اور بالعموم مسلمانوں کی واقفیت کے لیئے ذیل میں پیش کیئے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جو تدابیر اُن کی بہبودی کے لیئے ہمارے نزدیک ہیں وہ بھی عرض کی جائیں گی۔ ذیل کے نقشہ سے مسلمانوں کی نسبتی مردم شماری اور اُن کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوگا۔ کل ریاست مارواڑ میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۲ر۷ فی صدی ہے جو نا قابل توجہ ہے اس لیئے صرف شہر جودھپور کے اعداد درج کیئے جاتے ہیں۔

نام قوم	مردم شماری		خواندہ		انگریزی داں	
	تعداد	فی صدی	تعداد	فی صدی	تعداد	فی صدی
جملہ اقوام	۷۳و۳۸۰	ر۷۶	۱۲و۱۱۵	۸ر۲	۲۳۱۰	۳ر۰
مسلمان	۱۸و۱۲۵	ر۲۴ر	۱و۵۲۶	۸ر۳	۱۳۶	ر۷

اس نقشہ سے ظاہر ہو کہ خاص شہر جودھپور میں مسلمانوں کی تعداد ۲۵۔۱۸ یعنی دیگر اقوام کے مقابلہ میں ۲۴ فی صدی یا چہارم سے قدرے کم ہو۔ اب سب سے اول یہ دیکھنا ہو کہ وہاں مسلمان خواندوں کی نسبتی تعداد کس قدر ہو۔ مندرجہ بالا نقشے سے معلوم ہوتا ہو کہ دیگر اقوام کے اور مسلمانوں کے خواندہ افراد کی تعداد ۲ء۸ فی صدی یا مساوی ہو البتہ مسلمان انگریزی دانوں کی ۷ء اور دیگر اقوام کی تین فی صدی یا مسلمانوں سے چار گونی سے زیادہ ہو۔

اس وقت نہ صرف انگریزی عملداری میں بلکہ ریاستوں میں بھی اعلےٰ عہدوں کے لیئے انگریزی کی اعلیٰ قابلیت ایک لازمی چیز ہو اس لیے مسلمانوں کے انگریزی داں نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ریاست کے عہدوں سے محروم ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہو کہ مسلمانوں کو چھوڑ کر دوسری قوموں کے وہاں اسکول ہیں اور ریاست کی طرف سے جو اسکول ہو اس میں بھی مسلمان بچے اپنی نسبتی تعداد کے اعتبار سے کم ہیں۔ انگریزی تعلیم کے بعد دیسی زبان کی واقفیت ہو۔ اس کے لیئے مسلمانوں کے مدارس و مکاتب ہیں مگر مسلمانوں کے مدارس و مکاتب کی عام حالت یہ ہو کہ اُن میں اُن کی عمر کا بڑا حصہ صرف ہو جاتا ہو لیکن وہاں وہ نہ اپنے دین سے کافی طور پر واقف ہو پاتے ہیں اور نہ دنیا سے۔ دیگر اقوام کے بچوں کی حالت یہ ہو کہ وہ ہندی زبان کے ابتدائی مکاتب میں سال بھر رہ کر ہندی لکھنا پڑھنا اور حساب کتاب سیکھ کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اگر آئندہ تعلیم جاری نہ رکھیں تب بھی دکان پر

بیٹھ کر اپنا حساب کتاب رکھ سکتے ہیں۔ مگر مسلمان اپنے مدارس میں برسوں کی سالہا سال کی تعلیم کے بعد بھی کسی قابل نہیں ہوتے ہیں جب کہ مسلمان اپنے آپ کو نہ سرکاری عہدوں کے قابل بناتے ہیں اور نہ کاروبار کے تو پھر ان کی کھپت کہاں ہو۔ البتہ اب ان کے لیے دو شعبے باقی رہ جاتے ہیں۔ زراعت اور صنعت۔ ظاہر ہے کہ زراعت اس وقت ادنیٰ درجہ کی مزدوری کی مرادف ہے۔ یہی حال صنعت و حرفت کا ہے کہ اگر سرمایہ نہ ہو تو وہ کشیٹ مزدوری اور سرمایہ داروں کی غلامی ہے جس میں ہر مقام کے مسلمان مبتلا ہیں۔ چنانچہ جودھپور کی نسبت بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے ریل کے کارخانہ میں مسلمان کاریگروں اور مزدوروں کی کثرت ہے۔ اسی طرح پارچہ بافی، رنگریزی، رنگسازی، آہنگری، سنگ تراشی اور معماری وغیرہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں وہ تمام دن سخت محنتیں کرتے ہیں۔ جو کچھ کماتے ہیں اس کا ایک حصہ قرضہ اور سود میں مہاجن کو دے دیتے ہیں۔ باقی کھا چاٹ کر ہمیشہ دوسروں کے دست نگر اور پریشان رہتے ہیں۔

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ مسلمان اس لیے مفلس رہتے ہیں کہ وہ محنت نہیں کرتے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جتنے مشقت اور عرق ریزی کے کام ہیں وہ سب مسلمان کرتے ہیں۔ چنانچہ دستکاری کے جتنے پیشے ہیں اور ہتھوڑا بجانے، اور پتھر توڑنے اور اسی قسم کے جتنے سخت کام ہیں ان میں مسلمانوں کا غالب حصہ ہے مگر باوجود ان سخت فرسا کاموں کے

اختیار کر لیتے گئے اگر وہ دس دن کو بیکار یا بیمار ہو جاتے ہیں تو قرض لینے
یا بھیک مانگنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پس جو لوگ ان مصائب سے تنگ
آکر دل بہلانے کے لیئے تیتر لڑاتے یا پتنگ بازی کرتے تاش و گنجفہ کھیلتے
یا قمار بازی اور نشہ بازی کرتے ہیں یا بیٹھکوں میں خالی بیٹھے رہتے ہیں وہ
درحقیقت اُن تھکے اور ماندہ لوگوں کی مانند ہوتے ہیں جو ہمت ہار چکے
وہ صریحاً دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ اُن سے بہ درجہا کم محنت کر کے
آرام سے دکانوں اور کارخانوں میں بیٹھے اپنے روپیہ کے زور سے
دوسروں سے مویشیوں کا سا کام لیتے ہیں۔ کام لینے والوں اور کام
کرنے والوں دونوں کے ہاتھوں میں روپیہ آتا ہے۔ مگر کام کرنے والے
اُس کا مصرف بجز اس کے نہیں جانتے کہ اُسے کھا جائیں یا اُس سے
اچھے کپڑے یا عورتوں کا زیور بنوا دیں، چاہے پھر دوسرے
ہی دن مہاجن کے ہاں کیوں نہ رہن رکھ آئیں۔ بہرحال دُنیا میں
رہنے کے طریقوں سے وہ واقف نہیں اس لیئے سدا برباد اور تباہ حال
رہتے ہیں۔

ان کے دلوں میں خدا کا خوف ہے دینداری اور فیاضی بھی ہے مگر
اپنے جذبات پر قدرت نہ رکھنے کی وجہ سے جو کچھ آتا ہے وہ فضول
کاموں میں خرچ کر دیتے ہیں اس لیئے خیرات کرنے اور قومی کاموں
میں صرف کرنے کی ہوس اُن کے دلوں میں ہی رہتی ہے اور کبھی پوری
نہیں ہو پاتی۔ دوسری قوم کے لوگوں کو جنہیں وہ خدا ترسی، مذہبی

حمیت اور فیاض دلی میں اپنے سے کمتر جانتے ہیں، صریحاً دیکھتے ہیں کہ وہ جگہ جگہ سائبان بناتے اور راہ گیروں کے لیئے پیاؤ لگاتے ہیں مویشیوں کے لیئے پانی پینے کا انتظام کرتے ہیں، گاؤں گاؤں کھیتوں چرندوں پرندوں کو اناج دانا گھاس ڈلواتے ہیں تالابوں کے گرد سرسبز درخت لگوا لیتے ہیں اور یہ خود باوجود قوت ایمانی رکھنے کے اپنی مسجدوں، مدرسوں، اور اسکولوں تک کو ٹھیک حالت میں نہیں رکھ سکتے جن پر اُن کی انفرادی اور قومی زندگی کا مدار ہے کوئی شخص یہ نہیں مان سکتا کہ مسلمان تنگ دل ہیں، خسیس ہیں اس لیئے وہ خیرات اور قومی بھلائی کے کاموں میں کم دیتے ہیں کیونکہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کوئی مذہبی کام پیش آجاتا ہے تو جو کچھ اُن کے پاس ہوتا ہے وہ دے ڈالتے ہیں، عورتیں اپنے زیور اتار کر دے دیتی ہیں اور اس کی نظیریں موجود ہیں کہ بعض مسلمان اپنے گھر سے نکل کر کھڑے ہو گئے اور چندہ مانگنے والوں سے کہا کہ جو کچھ گھر میں سامان ہے وہ سب لے جا کر مکان میں جھاڑو دیدیں۔ اب مسلمانوں کے سامنے سوال یہ ہے کہ خسیس اور بخیل اور تنگ دل اور دُنیا دار اور دنیا پرست لوگوں کے قومی اور مذہبی کام کیوں روز افزوں رونق پر ہیں اور زیادہ اور فیاض طبع دین دار اور خدا پرست مسلمانوں کے قومی اور مذہبی کام کیوں برباد ہیں؟ کیا اس وجہ سے کہ اُن کے پاس روپیہ ہے اور وہ دیتے نہیں یا سرے سے اُن کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ اس کے جواب میں میں صاف طور پر عرض کروں گا کہ اب بحیثیت قوم کے مسلمان تہی دست ہیں

اُن کے قومی جسم کا خون مدّتوں سے بہہ رہا ہے نیا خون پیدا نہیں ہوتا
اس لیئے وہ بے دم پڑا ہوا ہے۔ مشرق سے غرب تک اور جنوب سے
شمال تک ہندوستان کے مشرق اور جنوب سے نہیں بلکہ کرۂ ارض
کے قطب شمالی سے لیکر قطب جنوبی تک اور امرا سے لیکر عوام تک
اور سلطنتوں سے لیکر افراد تک کے اسلامی جسم کے اعضا بھی خون کی وجہ سے
سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ اس مایوس کن حالت سے پریشان ہوکر کوئی تو
اُن اعضا کی مالش کرتا ہے، کوئی انھیں سینکتا ہے کوئی انھیں بھاپ سے
گرم کرکے اُن میں حرارت پیدا کرنا چاہتا ہے اور جب کچھ فائدہ نہیں ہوتا
تو کہا جاتا ہے کہ جب کہ قومی جسم عمر طبعی کو پہونچ چکا تو ان تدابیر سے
بوڑھے ہاتھ پاؤں میں کیسے جان پڑ سکتی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ابھی
یہ اُس کی نو عمری کا زمانہ ہے کیونکہ اس وقت دنیا میں جتنے مسلمہ طور پر
آسمانی اور قدیم مذاہب ہیں اُن سب میں اسلام نیا ہے پھر اس کی کیا
وجہ ہے کہ اُس کے ماننے والے جہاں کہیں بھی ہیں مضمحل ہیں اور جو تدبیر بھی
اپنی بہبودی کی اختیار کرتے ہیں وہ راس نہیں آتی؟ اُس کی وجہ
صرف یہ ہے کہ قومی جسم سے ہر وقت خون جاری ہے اس لیئے بہترین غذائیں
اور اعلیٰ ترین مقویات جو استعمال کی جاتی ہیں بیکار ثابت ہوتی ہیں
اور اسی طرح بیکار ثابت ہوتی رہیں گی جب تک کہ قومی جسم سے
بہتا ہوا خون بند نہ ہو۔ وہ خون کیا ہے؟ وہ خون وہ ہے جو سود کی شکل
میں مسلمانوں کے جسموں سے بہتا رہتا ہے۔ اور جب تک کہ وہ جاری

رہیگا باوجود تمام تر ترقی کی کوششوں کے اُن کی حالت روز بروز کمزور ہوتی چلی جائے گی۔

بعض ہمدردان قوم کا خیال ہی کہ اگر سود کے قانون میں مناسب ترمیمیں ہو جائیں تو مسلمان بربادی سے بچ سکتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے کوشش ہو رہی ہی کہ دام دوپٹ کا قانون جو بعض صوبجات میں ہند وؤں سے مخصوص ہی اُسے کل ملک کی جملہ اقوام کے لیے عام کر دیا جائے۔ دام دوپٹ سے مراد ہی کہ دائن کو اصل رقم سے زیادہ سود نہ دلایا جائے۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ کے رائج ہونے سے مسلمانوں کو جو ایک ایک کے دس دس دینے پڑتے ہیں اس سے نجات مل جائیگی اور اُن کی حالت بہتر ہو جائے گی مگر غور طلب امر یہ ہی کہ جن مقامات میں اُن کے خلاف دوگنی رقم سے زیادہ ڈگری نہیں دی جاتی وہاں اُن کی حالت کیوں خراب ہی۔ مثلاً بعض ریاستوں میں جن میں سے ایک جودھپور ہی مجھے معلوم ہوا ہی کہ وہاں کی عدالتیں اصل رقم سے ڈیوڑھے یا دوگنے سے زیادہ کی ڈگری نہیں دیتیں تاہم وہاں کے مسلمان غیر اقوام کے سرمایہ داروں کے دست نگر مفلس اور پریشان حال ہیں

مسلمانوں کا ایک یہ بھی خیال ہی کہ وہ بالعموم مسرف ہیں اس لیے مقروض رہتے ہیں۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اسراف کی علت بھی یہی ہی کہ وہ روپیہ کا مصرف اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ جب اُن کے ہاتھ میں روپیہ آئے اُسے خرچ کر ڈالیں۔ اس لیے جب

اُن کے پاس نہیں ہوتا تو وہ قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔
پس مسلمانوں کے مرض کا حقیقی علاج یہی ہے کہ انھیں روپیہ کا سچانا اور بڑھانا سکھایا جائے مگر جب تک کہ روپیہ کا بڑھانا نہ سکھایا جائیگا انھیں بچانے کی ہرگز رغبت نہ ہوگی۔ اب بڑھانے کے متعلق سوچنا پڑے گا کہ اس کی کیا صورت ہے؟ اس کی صورت یہ ہے کہ پیسوں سے لیکر روپیوں تک جو کچھ بچے اُسے بلا انتظار اس کے کہ کوئی بڑی رقم جمع ہو کسی ڈاکخانہ یا بنک میں جمع کیا جائے۔ نفع آور کاموں میں لگایا جائے مسلمان دکانداروں، کاریگروں کو معین اور غیر معین منافع پر دیکر انھیں دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کی غلامی سے آزادی دلائی جائے سفر ڈا اور منتظر گاکاروبار اور روپیہ کے لین دین کی کوٹھیاں کھولی جائیں جو مناسب شرح منافع پر کاروبار کرنے والے مسلمانوں کو روپیہ دیں
بعض اصحاب ناواقفیت کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ آپس میں مسلمانوں میں معین منافع پر روپیہ کا لین دین جاری ہوگا تو اُن کے دل سخت ہو جائینگے وہ بے رحم ہو جائیں گے۔ اُن کے دلوں میں اپنے بھائیوں کا درد باقی نہ رہے گا۔ مگر مسلمان آنکھیں کھول کر دیکھیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہوا بالکل بدل چکی اور بہت سی اخلاقی خوبیاں اُن قوموں میں منتقل ہو گئیں جو روپیہ کا کاروبار کرتی اور تجارتی سود کا لین دین کرتی ہیں۔ اور مسلمان جو اس سے بچتے ہیں اُن میں سے باہمی محبت و اخوت، ہمدردی اور دردمندی سب اُڑ گئی اُن کے قومی کاموں کی جو حالت ہے وہ اوپر مختصر طور پر عرض کی گئی اور انفرادی

حالت ہر شخص اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں میں دیکھ لے یتیموں اور بیواؤں اور اُن کے مال و جائداد کی حالت تقریباً ویسی ہی مخدوش ہے جیسی کہ اسلام سے قبل تھی کہ جو اُن کا ولی و سرپرست ہوتا تھا وہ یتیموں اور بیواؤں کا مال خرد برد کیا کرتا تھا۔ اب افلاس اور صرف قومی تہذیب نے زن و شوہر، باپ اور بیٹے میں، بھائی اور بہن میں بے اعتباری پیدا کر دی ہے۔ ایسی قوم سے جس کے افراد میں نفسی نفسی کا عالم ہو یہ توقع کرنا کہ وہ مل کر اپنی قوم اور ملک کو بچا سکیں گے ایک خیال خام ہے۔ پس میں مختصر طور پر اپنے برادران قومی کی خدمت میں ملتمس ہوں کہ وہ مندرجہ بالا کاروبار جاری کرنے کے علاوہ اپنے خانگی پروگرام میں سب سے اوّل حسب ذیل تدابیر کو جگہ دیں :-

(۱) ہر شخص اپنی آمدنی کا ایک معین حصہ پس انداز کر کے اُسے کسی ایسے معتبر بنک میں رکھے یا کام میں لگائے جہاں وہ بڑھتا رہے۔ اگر کسی شخص کو اس کا منافعہ اپنے صرف میں لانے میں تامل ہو تو وہاں سے لیکر کسی کار خیر میں لگا دے جس کی نسبت علمائے کرام میں اختلاف نہیں ہے۔

(۲) اپنے ہر بچہ کے لیے گھر میں گولک بنا دے۔ بچہ جو پیسے اس میں جمع کرے اُس پر انعام دیا جائے۔

(۳) اپنی زندگی کا بیمہ اور اپنے بچوں کا تعلیمی بیمہ کرائے۔

ان کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک انجمن از نام "فلاح المسلمین" قائم کی جائے اور اس کا کام باقاعدہ شروع کیا جائے۔

مسلمانوں کی دوسری ضروری چیز تعلیم ہے جس کی اہمیت سے سب واقف ہیں۔ بالعموم مسلمانوں کو جب تعلیم کی طرف توجہ ہوتی ہے تو وہ اپنے طور پر بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں۔ اپنے مکتب، مدرسے اور اسکول کھولتے ہیں۔ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ درسگاہیں خراب حالت میں رہتی ہیں اور انجام کار ان میں پڑھنے والے بچے برباد ہوتے ہیں اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ جس قدر سرکاری اور دیگر اقوام کے مدرسے ہیں ان سے بلا تکلف مسلمانوں کو نفع اٹھانا چاہیئے اور اپنے بچوں کو ان میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخل کرا کر انھیں وہاں پڑھایا جائے اور جو بچے نادار ہیں ان کی فیس اور کتابوں کا انتظام اپنی انجمن سے کرکے انھیں دیا جائے۔ اس صورت سے تھوڑے صرف اور کم وقت میں زیادہ تعداد میں بچے پڑھ جائیں گے۔

اس زمانہ میں تعلیم کا ہر مقام پر اور ہر قوم میں چرچا ہے اس لیے ہندی اور ناگری صرافی اور اپنے دیس کی زبانوں کو لوگ تھوڑے وقت میں سیکھ کر حساب کتاب لکھنے اور کتابیں پڑھنے لگتے ہیں۔ اور سال دو سال میں بازار میں بیٹھ کر تجارت کے کام میں ماہر ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی علم اور کوئی زبان کیوں نہ ہو اس کے پڑھنے سے عقل میں ترقی ہوتی ہے۔ اس لیے جس زبان اور جن حروف کا ان کے دیس میں رواج ہو وہ اپنے بچوں کو ضرور بالضرور پڑھوائیں تاکہ مقامی کاروبار اور ملازمتوں میں حصہ پانے میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس لیے میں مسلمانان چھوٹا

کی خدمت میں ملتجی ہوں کہ اگر ریاست کے دفتروں اور بازاروں میں ہندی حروف اور حساب وکتاب کا رواج ہے تو وہ ضرور بالضرور اپنے بچوں کو ہندی زبان میں تعلیم دلائیں بعض اصحاب کو اندیشہ ہوتا ہے کہ ہندی یا انگریزی زبان پڑھنے سے مذہب میں کچھ خلل آجاتا ہے۔ یہ محض توہمات اور تخیلات ہیں جس زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مذہبی علوم صرف عربی زبان میں تھے تب مسلمان فارسی پڑھنا ناجائز سمجھتے تھے۔ جب فارسی میں مذہبی علوم آگئے تو سمجھا جاتا تھا کہ مذہبی تعلیم کے لیئے فارسی لازمی چیز ہے اب خدا کے فضل سے اردو میں دینیات کی کتابیں بہ کثرت ہیں اور لاکھوں آدمی نہ عربی جانتے ہیں اور نہ فارسی تاہم اردو کتابوں کی وجہ سے مذہبی ارکان سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی طرح کروڑوں مسلمان چین میں آباد ہیں جو عربی، فارسی اور اردو میں سے کوئی زبان نہیں جانتے تاہم ہم سے کم پختہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ سنا گیا ہے کہ وہ بوجہ اقتصادی حالت بہتر ہونے کے اسلام کی خوب اشاعت کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ وہ تھا کہ انگریزی پڑھنے والا، لا مذہب سمجھا جاتا تھا مگر اب بہت سے انگریز مسلمان ہیں اور انگریزی زبان میں مذہب اسلام کے متعلق کثرت کتابیں اور رسالے اور اخبارات شایع کرتے ہیں۔ پس اسلام کی قوت اس میں نہیں ہے کہ اسے کسی خاص زبان پر محدود کردیا جائے بلکہ ضرورت ہے کہ ملک کی مختلف زبانوں کو اسلامی اور مذہبی معلومات سے مالا مال کردیا جائے۔ جو اصحاب مذہب اسلام کو زندہ رکھ کر اسے قومی بنانا

چاہتے ہیں اُنھیں چاہیئے کہ جس زبان اور جن حروف کا اُن کے ہاں رواج ہو وہ اپنے بچوں کو پڑھائیں اور اُس زبان اور حروف میں اپنی مذہبی اور دینی کتابوں کی بھرمار کر دیں۔

آخر میں مسلمانانِ جودھ پور کی خدمت میں ملتجی ہوں کہ وہ مندرجۂ بالا معروضات کو پیشِ نظر رکھ کر خود اپنے لیئے ایک راہِ عمل تجویز کریں کسی بیرونی شخص کو مقامی حالات کا صحیح اندازہ ہونا مشکل ہے قوم کے سر بر آوردہ اصحاب جمع ہو کر اپنی قوم کی مالی اور تعلیمی حالت کا جائزہ لیں اور باہمی مشورہ سے جو کچھ طے ہو اُس پر مضبوطی سے قایم رہ کر کم از کم پانچ سال تک اُس کا تجربہ کریں۔ اگر مسلمانانِ جودھ پور خدا کے فضل و کرم سے اپنی مقامی حالت درست کرنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ دوسری ریاستوں کے مسلمانوں کے لیے ایک عمدہ نمونہ قایم کریں گے۔

جولائی ۱۹۲۵ء

---

(۱۳)

کیا طفیل احمد واقعی سحر نگار ہے؟

سر زا ہوں جمع ہو چکیں لذت لہنت کو
مدّت ہوئی ہے دعوت مژگاں کیئے ہوئے

"صدائے مسلم" لاہور کے ایڈیٹر صاحب نے نہایت دلسوزی

سے میری اقتصادی تحریک کے خلاف ایک زبردست افتتاحیہ لکھا ہے جس سے
ان کی مذہبی شیفتگی اور جوش اسلامی کا اندازہ ہوتا ہے اس مضمون میں ایڈیٹر صاحب
نے نہایت مہربانی سے اس خاکسار کے متعلق یہ خیال ظاہر فرمایا ہے کہ وہ
زرپرست نگار ہے میں اس حسن ظن کا شکر گزار ہوں کاش ایسا ہی ہوتا لیکن
من آنم کہ من دانم

بلکہ میں بغیر کسی شرم و حجاب کے یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا
کہ کاش میری یہ تمنا ہے کہ میں سحر نگار ہوتا میری یہ آرزو ہے کہ جادو بیان
ہوتا اور کچھ نہیں تو شاعر ہی ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ میری آنکھیں جو
الم ناک نظارے اور روح فرسا واقعات دیکھتی ہیں وہ دوسروں کو بھی
دکھاتا، اور سناتا اور اس وقت قوم جس کرب و مصیبت میں مبتلا ہے
اس کی سچی تصویر کھینچ کر قوم کو دکھاتا خود بھی روتا اور ان کو بھی رلاتا، اور
نالہ و شیون کی ایسی صدائیں بلند ہوتیں جو قوم کو خواب غفلت سے بیدار
کر دیتیں۔ اے کاش! خدا تعالے نے یا تو قوم کی مصیبت کا احساس
نہ دیا ہوتا اور اگر احساس دیا تھا تو بقدر احساس زبان و قلم میں بھی
طاقت دی ہوتی تاکہ میں قوم کو بتاتا کہ وہ اس وقت کیسے خطرہ کی
حالت میں ہے اور اس کا مستقبل کیسا تاریک و اندوہ ناک ہے، افسوس کہ ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

غرض واقعہ یہ ہے کہ میں تو سحر نگار نہیں ہوں، لیکن میری غریب قوم، میری مصیبت زدہ قوم ضرور سحر زدہ ہے۔ کاش وہ اس جادو کے قلعہ سے نکلتی اور دیکھتی کہ اغیار کی چیرہ دستیوں نے اب اس کو کس حالت پر پہونچا دیا ہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ اب بھی ان کو تھپکیاں دے دے کر سلایا جاتا ہے۔ افریقہ و ترکی کے مسلمانوں کی ترقی و عروج کی داستانیں ہندوستان میں افسانۂ بزم و انجمن ہیں اور بیچارے مسلمان اپنے دل کو اس طرح تسلی دے لیتے ہیں کہ خیر ہم نہ سہی، ہمارے دوسرے بھائی ہی ترقی کر رہے ہیں اور مصر و حجاز میں مسلمانانِ ہند کے جوشِ ملی اور حُبِّ وطن قومی کے قصّے زبان زدِ خاص و عام ہیں اور وہاں کے بہت سے خوش عقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند عالمِ اسلامی کی رہبری کریں گے اور ان کو مصیبت سے نجات دلائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

یہ سب کچھ درحقیقت اغیار کا پروپیگنڈا ہے اور یہ بیا وہی جادو ہیں جو ہم کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ کاش! مسلمان سمجھیں اور غور کریں سوچیں اور سمجھیں اور پھر اس جادو سے نکلنے کی کوشش کریں لیکن اس کے لیے ضرورت ہے عزم و حوصلہ کی ہمت و استقلال کی۔ اگر مسلمان ایک دفعہ یہ عزم کر لیں اور اپنے دل میں یہ ٹھان لیں کہ ہم اگر اس دنیا میں رہیں گے تو عزت و آبرو کے ساتھ رہیں گے تو یقین کیجئے کہ ایسا ہی

ہوگا! ہمارے اندر جو کچھ خرابی ہے وہ ہماری ہی بدولت ہے۔ اب اگر ہم خود ہی اصلاح پر متوجہ ہوں، تو ہم کو کون روک سکتا ہے۔ خدا اُنھیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں ؎

عام ہیں اُن کے تو الطافِ شہیدی سب پہ
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

میں نہیں کہہ سکتا کہ قوم میں اپنی مالی اصلاح کا احساس کس حد تک پیدا ہو گیا ہے اور اس میں کتنے ایسے ہیں جو ہماری صدا سے متاثر ہوئے ہیں لیکن اگر قوم میں فی الحقیقت کوئی احساس پیدا ہو گیا ہے تو یہ ہماری سحر نگاری کا نتیجہ نہیں بلکہ واقعات کا اقتضا ہے واقعات و مصائب اس قدر دردناک ہیں کہ اب دامنِ صبر لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور وہ بے چین ہیں کہ اس مصیبت سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کریں۔ جن لوگوں کو قوم کی اس درماندگی اور اضطراب کا احساس ہے وہ نیک نیتی سے اپنی اپنی سمجھ کے موافق طرح طرح کی تدبیریں بتاتے ہیں اور قوم حالت از خود رفتگی میں اُن تدابیر پر عمل کرنے کو جھک پڑتی ہے۔ لیکن نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ مایوسی اور ناکامیابی، ناکامی و نامرادی اس لیے قوم دل شکستہ ہو جاتی ہے اور جب امید کی کوئی روشنی اور کامیابی کی کوئی جھلک اس کو نظر نہیں آتی تو قدم ڈگمگا جاتے ہیں، استقلال رخصت ہو جاتا ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتی ہے

اور سمجھ لینی ہو کہ تقدیر برگشتہ ہی اور زمانہ مخالف۔ اس لیئے کوشش بے سود، اور جد و جہد لاحاصل ہے

حسرت پر اس مسافر بیکس کی رویئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

میں نے جب ہوش سنبھالا اور آنکھیں کھولیں تو قوم کی یہ عبرت انگیز حالت سامنے تھی کم و بیش ایک چوتھائی صدی سوچا اور غور کیا کہ آخر اس مصیبت کا علاج کیا ہی؟ جو جو علاج بتائے جاتے تھے سب کو دیکھا، جانچا، آزمایا، مگر نتیجہ ہیچ، آخر کار ایک مدت کی تلاش و جستجو کے بعد وہ گوہر گم گشتہ جس کی تلاش تھی ہاتھ آگیا تو میں نے چاہا کہ اس کو قوم کے سامنے پیش کروں چنانچہ پانچ چھ سال سے بقدر اپنی طاقت و استطاعت کے اس خدمت میں مصروف ہوں۔ ہماری سب سے بڑی تمنا اور آرزو یہ ہو کہ افراد قوم فارغ البال ہوں، اُن کے چہرے شگفتہ، اُن کے ارادے زبردست ہوں، ان کے حوصلے بلند ہوں اور زندگی بخش صحت کا خون بجلی کی طرح ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہو، اور وہ مال و دولت اور شان و شوکت میں دنیا کی دوسری ترقی یافتہ اور سربرآوردہ قوموں کے دوش بدوش نظر آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری یہ صدا خواب غفلت میں سونے والوں کو تلخ و ناگوار ہوگی اور اس کا بار بار اعادہ اور بھی زیادہ صبر شکن، لیکن آخر چارہ کار کیا ہی؟ ایک خوفناک طوفان کے آثار ہر طرف

نمایاں ہیں۔ کالی کالی گھٹائیں گھمنڈ کر رہی ہیں۔ ایسی صریح خطرہ کی حالت میں خاموشی بظاہر مشکل ہے۔ اگر بعض محبان اور بزرگان قوم سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ چیخ پکار صدا لئے بے ہنگام ہے تو وہ جانیں اور ان کا کام۔ ہم تو ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اب سوال یہ ہے کہ وہ خطرہ کیا ہے؟ اور وہ کونسی چیز ہے جس نے اسلام کے زبردست وطاقتور جسم کو نحیف ونزار کر دیا ہے، اور وہ کونسی خوفناک طاقت ہے جس نے شیروں کو لومڑی بنا دیا ہے؟ وہ سود کی خوفناک بلا ہے، وہ سود کا ہیبت ناک نشتر ہے جس کی نوک رگوں سے ٹکراتی ہے اور خون اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن بہت سے بدنصیب ایسے ہیں جن کو اپنے طاقتور جسم کی وجہ سے اس نشتر کی خبر بھی نہیں ہوتی لیکن تاہم کہ جب اذیت بڑھتی ہے تو مڑ کر نگاہ غلط انداز سے دیکھتے اور بے پروائی سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اپنی جسمانی قوت کے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ اور تازہ خون پیدا ہو جائے گا لیکن ان کی یہ اُمید کبھی پوری نہیں ہوتی بلکہ کمزوری و ناتوانی روز بروز بڑھتی جاتی ہے جو آخر کار ان کو از کار رفتہ کر دیتی ہے، الّلہ الّلہ!! وہ مسلمان جو کبھی تیغ وتفنگ اور تیر وخنجر کے سامنے سینہ سپر ہو کر کٹتے تھے آج سود خواروں کے غلام ہیں

اور اپنی دولت و عزت، مذہب اور خاندان کی حرمت کو اس طرح برباد کر چکے ہیں اور اپنے بزرگوں کی جائدادوں کو خود اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں، آہ! کس کو خبر ہے کہ ہماری قوم کے کتنے افراد ایسے ہیں جو سود کے کشتۂ ستم ہیں اور جن کو اسی غم اور مصیبت نے لب گور تک پہونچا دیا۔ وہ اس تکلیف و ذلت کو برداشت نہ کر سکے اور گھل گھل کر فنا ہو گئے اور ان کی اولاد جس کو انھوں نے ناز و نعمت میں پالا تھا آج دنیا کی کشمکش میں تنہا رہ گئی۔

اے سنسان قبرستانوں کی خاموش قبروں کاش خدا تمھیں لب گویا عطا کرتا اور تم ہمیں بتاتیں کہ تمھارے اندر کیسے کیسے جواہر گراں مایہ مخفی ہیں اور قوم کے کیسے کیسے تنومند نوجوان تمھارے اندر محو خواب ہیں جو شیروں سے بھی ہاتھ ملانے میں نہیں ڈرتے تھے لیکن سود کے حملہ کی تاب نہ لا سکے اور اپنی عزت و دولت اور ننگ و ناموس کو برباد کر کے آبادی سے باہر ویرانہ میں آ بسے تاکہ حشر تک آرام سے سوئیں۔

بہر حال مرنے والے تو مر گئے لیکن وہ اپنے ویران کھنڈروں، شکستہ در و دیوار، اور مصیبت زدہ کنبے کو چھوڑ گئے ہیں تاکہ زندہ اُن سے عبرت و بصیرت حاصل کریں، اور غور کریں کہ پہلے وہ کیا تھے اور اب کیا ہیں؟ اور انھوں نے اپنی اولاد کو اس دنیا کی کشمکش کے لئے کس حد تک تیار کیا ہے؟

اے دوستو! ذرا خدا کے لیے سوچو کہ زمانہ کا رُخ کس طرف ہے؟ اور تم کس طرف جا رہے ہو؟ کیا یہ مقام عبرت نہیں ہے کہ جس قوم نے کبھی قیصر و کسریٰ کے سامنے سر نہ جھکایا، آج وہ سرمایہ داروں اور سود خواروں کی انگلیوں پر

ناچتی ہو سرمایہ دار جونک کی طرح اُس کا خون چوس رہے ہیں اور وہ اُف
نہیں کرتی، برائے خدا ذرا سوچو تو کہ یہ کیا حالت ہو اور کدھر جا رہے ہو
اگر تم میں کچھ لوگ اتفاق سے دولتمند ہیں تو یہ نہ سمجھیں کہ یہ دولت اسی
طرح ان کے خاندان میں رہے گی۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ آج جو تم میں غریب
مفلس ہیں وہ سدا سے غریب نہیں کبھی وہ اُن کے باپ دادا کے پاس بھی دولت
تھی، جائداد تھی، وہ بھی عزت و آبرو رکھتے تھے لیکن آج محتاج ہیں۔ جب
تمہاری سلطنتیں مٹ گئیں تو یہ ذرا سی دولت کیا چیز ہو۔ شہنشاہ تغلق کی
اولاد آج گھاس بیچتی اور تیموری شاہزادے بھیک مانگتے ہیں، جب حالت
یہ ہو تو دوستو تم کیونکر کہہ سکتے ہو کہ تمہاری یہ دولت ہمیشہ باقی رہے گی۔ بالکل
ممکن ہو کہ حوادث زمانہ اس کو تمہاری زندگی ہی میں برباد کر دیں۔ کیا تم نے
کسی کی دولت و جائداد کو کبھی تباہ ہوتے نہیں دیکھا، اگر دیکھا ہو تو پھر اس کی
کیا ضمانت ہو کہ جو کچھ دوسروں کو پیش آیا وہ تم کو نہیں پیش آئے گا۔

پس اے دوستو مقتضائے عاقبت اندیشی یہ ہو کہ تم اس دنیا میں رہنے
کے طریقے سیکھو اور اپنی اولاد کو دُنیا کی کشمکش کے لیئے تیار کرو، اور اُن میں
ایسی قابلیت پیدا کرو کہ وہ دولت کمانا اور اس کا بچانا سیکھیں، دلیری
کے ساتھ حوادث زمانہ کا مقابلہ کر سکیں، تم اپنی اولاد کو جفاکش، مضبوط،
محنت پسند اور کفایت شعار بناؤ اور خود بھی ایسے ہی بنو، تم سود
کے علاج بالمثل کے لیئے تیار ہو جاؤ پھر دیکھو کہ دولت اپنا رُخ کس طرف
پھیرتی ہو مگر جو کچھ کرنا ہو جلد کرو کیونکہ خطرہ کی گھنٹی بج رہی ہو مہلت کا وقت

گزر چکا ہے اب انتظار کا زمانہ نہیں۔ پند و وعظ کا وقت گزر چکا اسپیچ و لکچر کا دور ختم ہو گیا نالہ و فریاد بے سود ثابت ہوئی اب کام کا اور جد و جہد کا وقت ہے۔ بقول شاعر؎

تا چند رہو گے مست سرشار — اُٹھو کہ سحر ہوئی ہے ہوشیار
سوچو تو ذرا کہ حال کیا ہے — کس خواب میں ہو خیال کیا ہے
غفلت میں جو شب بسر ہوئی ہے — لو اب تو اٹھو سحر ہوئی ہے
کچھ تم کو خبر ہے یا نہیں ہے — کچھ دل پہ اثر ہے یا نہیں ہے
اغیار کی طنز کو بھی سن کر — لگتے نہیں کیا جگر پہ نشتر
دیکھو تو ذرا یہ حالت زار — کیوں قید بلا میں ہو گرفتار
ہو کر یہ صف پست کیوں ہو — اس بزم میں خوار ہو رہے کیوں
کیوں نیر قسمت کا ہوش نہ — بگڑا ہے تمہیں سے کیوں زمانہ
کس نے تمہیں اوج سے اتارا — اقبال نے کیوں کیا کنارا
کیوں بار ہو تم دل جہاں پر — کیوں برق بلا گری تمہیں پر
کس پیچ میں آ گئے پھنس کر — کیا ہے کہ اُجڑ گئے ہو بس کر
افلاس میں تم جو ہو گرفتار — بیٹھے ہو جو نقش پا سے بیکار
شکوے سے جو ہے بے زری کے تم کو — لالے ہیں جو نوکری کے تم کو
حرفت کو جو کر چکے ہو غارت — برباد جو ہو چکی تجارت
ہر علم و ہنر سے بے خبر ہو — صنعت میں جو تم شکستہ پر ہو
افعال جو سخت مبتذل ہیں — تدبیر کے دست پا جو شل ہیں

رونا ہے تمھیں اب آج جن کا | خود کردہ ہے کیا علاج ان کا
غفلت میں جو خواب سو چکے ہو | ہونا جو نہ تھا وہ ہو چکے ہو
دنیا کے نہ کام کے نہ دین کے | افسوس رہے نہ تم کہیں کے
نکبت کی گھٹا ہے سر پہ چھائی | افلاس کی ہر طرف دہائی
اب عیش نصیب ہے نہ آرام | گھر گھر میں مچا ہوا ہے کہرام
برباد پڑے ہیں کارخانے | نکبت نے مٹا دیئے گھرانے
رونق کا اثر نہ عیش کی بو | اک خاک سی اڑ رہی ہے ہر سو
امید کے دن کی ہو چکی شام | خورشید اب آ گیا لب بام

اب وقت اخیر ہے خبر لو
جو کچھ کرنا ہے اب بھی کر لو

اگست ۱۹۲۵ء

---

(۱۴) دری بافوں کی خراب حالت

صیغہ صنعت و تجارت نے جس کا صدر مقام کانپور ہے ہر ضلع کے صنعتی کاموں کی تحقیق و تفتیش بڑے اہتمام سے کرائی ہے اور ہر ضلع کی جداگانہ رپورٹیں مرتب کی ہیں جو قابل ملاحظہ ہیں۔ ذیل میں ضلع آگرہ کے دری بافوں کی کیفیت درج کی جاتی ہے جو رپورٹ مذکور میں تحریر ہے۔

دری بافوں کو بمشکل ان کی روزانہ مزدوری ملتی ہے کیونکہ سارا نفع دکاندار لیا

کی جیب میں جاتا ہے۔ دری بافوں کو دری کے تاجر دو یا تین روپیہ سیکڑہ ماہوار سود پیشگی روپیہ دے دیتے ہیں۔ دری باف اس روپیہ سے سوت خریدتے ہیں پھر دن بھر دریاں بنتے ہیں اور شام کو کناری بازار میں دری کے تاجروں کے ہاتھ ان کو فروخت کر دیتے ہیں۔ بعض وقت سوت بھی اُدھار لیا جاتا ہے لیکن اس صورت میں دری بافوں کو دو چند نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اوّل تو اُن کو بھاری سود دینا پڑتا ہے دوسرے ان کو سوت بازار کے نرخ سے گراں ملتا ہے۔ دری کی خرید و فروخت کا اصول یہ قاعدہ تھا کہ دری باف اپنی تیار کی ہوئی دری دُکان دار کو دکھاتا تھا۔ اگر قیمت طے ہو جاتی تو اس کو فوراً دام مل جاتے تھے۔ دکاندار صرف ایک پیسہ فی روپیہ کٹوتی کا کاٹ لیتا تھا اگر اس دکاندار سے دام طے نہ ہوتے تو وہ اپنی دری دوسرے دکانداروں کو دکھاتا اور بالآخر جس کسی سے دام طے ہو جاتے اسی کے ہاتھ اپنی دری فروخت کر دیتا تھا۔

لیکن اب اس طریقہ میں بہت کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے اب دری باف کلیتاً اپنے قرض خواہ اور دکاندار کے رحم پر رہتا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ جس روز دری تیار کرے اسی دن اس کو فروخت کر دے خواہ اس کو مناسب قیمت ملے یا نہ ملے ورنہ دوسرے دن اسے بھوکا مرنا پڑے گا۔ دری باف کو اکثر اپنے قرض خواہ یا اپنے دکاندار کے ہاتھ ہی دری فروخت کرنی پڑتی ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اس کی قیمت لگاتا ہے اگر قیمت کم ہوتی ہے اور دری باف اس کو قبول نہیں کرتا تو اس کو اپنی دری کسی دوسرے دکاندار کے ہاتھ فروخت

کرنی پڑتی ہے لیکن قرض خواہ، دری باف سے کہتا ہے کہ میاں اوّل میرا روپیہ ادا کر دو اس کے بعد میں تم کو اپنی دکان سے دری لے جانے کی اجازت دونگا اس لیئے دری کی مناسب قیمت لگانا صرف دکاندار کی نیک نیتی پر منحصر ہے جس کو دری باف بھی بخوشی منظور کرے۔ بعض دھرم کے کاموں کے لیئے کٹوتی تین پیسے فی روپیہ لگا دی گئی ہے جو دری بافوں سے وصول کی جاتی ہے دکانداروں کی ان نامناسب کاروائیوں سے عاجز آکر دری بافوں نے پنچایت کر کے ہڑتال کر دی اور فیصلہ کر لیا کہ ہم تین پیسے فی روپیہ کٹوتی ہرگز نہ دینگے جو دکانداروں کی بعض مذہبی سوسائٹیوں کے لیئے ہم سے وصول کیا جاتا ہے اور جن سے ہمارا کوئی مقصد اور کچھ تعلق نہیں ہے۔ ہڑتال پورے ایک مہینے تک رہی اس کے بعد باہمی تصفیہ ہو گیا جس میں شرح کٹوتی دو پیسہ فی روپیہ قرار دے دی گئی۔

دری بافوں کے لیئے دوسری مصیبت یہ ہے کہ دکاندار دری ناپنے میں بے ایمانی کرتے ہیں۔ جب وہ دری ناپتے ہیں تو مربع فٹ کی کسرت کو حساب میں نہیں لگاتے۔ اس لیئے غریب دری بافوں کا افلاس روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے اور اندیشہ ہے کہ عنقریب اس صنعت پر پورا زوال آجائے اس لیئے یہاں پر دری بافوں کو چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض دینا ان کو سوت دینے اور ان سے دریاں خریدنے کے واسطے ایک کوآپریٹو اسٹور قایم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ صرف اسی تدبیر سے غریب دری باف ظالم اور بیرحم سرمایہ داروں کے دست تظلم سے نجات پا سکتے ہیں"

(۱۵)

مسلم بنک

مسلم بنک لاہور ۱۹۱۲ء میں قایم ہوا تھا۔ اخبار مسلم آوٹ لک نے اس کی کمی سرمایہ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے اس کی حسب ذیل تفصیل دی ہے۔

۱۹۱۲ء میں ۱۰۵۷۰۰ روپیہ	۱۹۱۷ء میں ۱۰۰۰۰۰ روپیہ
۱۹۱۳ء میں ۱۲۸۵۰۰ روپیہ	۱۹۱۸ء میں ۱۳۰۰۰۰ روپیہ
۱۹۱۴ء میں ۶۱۰۰۰ روپیہ	۱۹۱۹ء میں ۱۸۵۰۰۰ روپیہ
۱۹۱۵ء میں ۶۶۰۰۰ روپیہ	۱۹۲۳ء میں ۶۳۸۰۰۰ روپیہ
۱۹۱۶ء میں ۸۱۰۰۰ روپیہ	

گویا بارہ سال میں مسلم بنک کا سرمایہ کل چھ لاکھ اڑتیس ہزار تک پہونچا ہے برخلاف اس کے سنٹرل بنک کا جو مسلم بنک کے ساتھ قایم ہوا تھا اس وقت سرمایہ بائیس ۲۲ کروڑ یعنی مسلم بنک سے ۳۴۵ گونہ ہے۔ مسلمانوں کا ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک بنک ہے جس کی حیثیت اوسط درجہ کے ایک مہاجن کے کاروبار کے برابر ہے برخلاف اس کے پنجاب میں ہندوؤں کے متعدد بنک ہیں جن کا سرمایہ کروڑوں روپیہ ہے۔ اس زمانہ میں بنک مرادف ہے تجارت کا۔ جس قوم کا حصہ بنکوں میں نہیں وہ تجارت سے خارج ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ روپیہ اپنے یا دیگر اقوام کے

بینکوں میں لگانا چاہیئے۔ بے شک ابتدا میں نقصانات کا اندیشہ ہے مگر اب تو سراسر ٹوٹا ہی ٹوٹا ہے۔ بینکوں میں روپیہ لگا کر نقصان اُٹھانے کے بعد افراد قوم کو کچھ تو تجربہ ہوگا جس سے وہ آئندہ کے لیئے ایسے طریقے سیکھیں گے جس سے روپیہ کا کاروبار اُن کے قبضے میں آ سکے۔

اگست ۱۹۲۵ء

---

(۱۶)

اسکولوں میں کفایت شعاری کی تعلیم

اسکولوں اور کالجوں میں جتنے لڑکے پڑھتے ہیں اُن میں زیادہ تر ایسے ہوتے ہیں جن کی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے اور بہت کم اعلیٰ جماعتوں تک پہونچ کر کامیاب ہوتے ہیں اور کامیاب ہونے والوں میں زیادہ تر دفتروں میں کلرکیاں یا اس سے بڑھکر اوسط درجہ کی ملازمتیں پاتے ہیں اور بہت کم اعلیٰ درجہ کے عہدوں پر پہونچ سکتے ہیں پھر اعلیٰ عہدوں پر پہونچنے والوں میں سے بھی کم ایسے ہوتے ہیں جن کا خرچ اُن کی آمدنی کے اندر رہتا ہو اس لیئے بالعموم متردد و پریشان رہتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ علوم عامہ کی تعلیم سے یہ ضروری نہیں کہ انسان سکون قلب اور اطمینان خاطر کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتے۔ البتہ کفایت شعاری کی تعلیم ایسی چیز ہے جس کے حصول کے بعد انسان خواہ کیسی ہی ادنیٰ حالت میں کیوں نہ ہو حقیقی معنوں میں اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ شمس العلما مولوی ذکاءاللہ جیسا

مرحوم سے کسی نے پوچھا کہ حقیقی خوشی انسان کو کس طرح حاصل ہو سکتی ہے فرمایا
اس طرح سے کہ انسان دس روپیہ کما کر اس میں سے آٹھ خرچ کرے اور دو بچائے
اس کے مقابلہ میں ایک شخص دس ہزار روپے کمائے اور گیارہ ہزار خرچ کرے
تو اس کے تردّدات اور پریشانیوں کی کوئی حد و انتہا نہیں رہتی۔ واقعہ
یہ ہے کہ بالخصوص مسلمانوں کی قوم اسی مرض میں مبتلا ہے کہ کمانے سے زیادہ
خرچ کرتی ہے جس سے اس کے افراد روز بروز تنزل اور پستی کی طرف جا رہے
ہیں اس لیئے ضرورت ہے کہ ابتدا سے بچّوں کو اسکولوں میں کفایت شعاری
کی تعلیم دی جائے جس سے وہ امتحانات میں اور امتحانات کے بعد
اعلیٰ عہدے پانے اور اعلیٰ مراتب پر پہونچنے میں کامیاب ہوں یا نہ ہوں
تاہم جس حالت میں وہ ہوں فارغ البال اور خوش و خرّم رہیں آج کل
غریب سے غریب شخص بھی اپنے بچّوں کو پیسے دیتا ہے اور وہ ان کے سامنے
مٹھائی اور چاٹ کی چیزیں کھا کر چٹورپن اور اسراف سیکھتے ہیں۔ ان مضر عادات
سے اُنھیں بچانے کے لیئے اسکولوں کے منیجر اور ہیڈ ماسٹر صاحبان اپنے اپنے
اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو کفایت شعاری پر ششماہی یا سالانہ انعامات
دیا کریں۔ اس کے لیئے حسب ذیل قواعد یا اُن کے قریب قریب جو مناسب
ہوں جاری کیئے جائیں۔

۱۔ اسکول کے کسی ماسٹر یا کلرک کے پاس ایک رجسٹر رہے جس میں
ہر طالب علم کے نام سے حساب کھول دیا جائے۔

۲۔ ہر لڑکا اپنے جیب خرچ میں سے بچا کر ایک پیسہ سے لیکر

روپیوں تک جو کچھ بھی دے اور جتنی بار دے وہ جمع کر لیا جائے اور ہر رقم کی رسید بچے کو دی جائے۔

۳۔ جب طلبا زیادہ جمع کرنے لگیں اور ہیڈ ماسٹر کو اس کا انتظام کرنے میں دقت ہو تو یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہو کہ ہر روز دو کلاسوں کی باری مقرر کر دی جائے کہ صرف اُن کے لڑکے اس دن روپیہ داخل کر سکیں۔ مگر جہاں تک ہو سکے اس قسم کی بندشیں نہ کی جائیں۔

۴۔ ڈاکخانہ کے سیونگ بنک میں ہیڈ ماسٹر اپنے عہدے کے اعتبار سے حسب قاعدہ ۴۴ (د) قواعد سیونگ بنک حساب کھول لیں اور طلبا جو کچھ جمع کریں وہ وقتاً فوقتاً ڈاکخانہ میں جمع کرتے رہیں اس میں یہ آسانی ہو کہ طلبا کا جدا جدا حساب صرف ہیڈ ماسٹر کے رجسٹر میں رہیگا اور ڈاکخانہ میں یکجائی رقم جس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں ہے جمع ہو سکے گی

۵۔ ہیڈ ماسٹر یہ دیکھتے رہیں کہ جس لڑکے کا روپیہ اتنا ہو گیا ہو کہ اس میں کیش سرٹیفکٹ خریدا جا سکے تو فوراً اس لڑکے کے نام سے خرید کر اُسے دیدیں یا اپنے اسکول میں بحفاظت رکھیں اگر کسی لڑکے کو کوئی رقم یکمشت مل جائے تو اُس سے بھی کیش سرٹیفکٹ فوراً خرید دیا جائے۔ واضح ہو کہ ساڑھے سات روپیہ میں جو سرٹیفکٹ خریدا جاتا ہو اُس سے پانچ سال میں دس روپے ہو جاتے ہیں اور پندرہ روپے سے بیس روپے اور پچھتر روپیہ آٹھ آنہ سے پچاس اور پچھتر روپیہ سے ایک سو روپیہ ہو جاتے ہیں۔

۶۔ طلبا کو کفایت شعاری پر انعام دیتے وقت یہ دیکھنے کی ضرورت

کہ کس لڑکے نے پابندی کے ساتھ معین اوقات پر پیسے، یا آنے یا روپے جمع کیئے مثلاً ایک لڑکا سال بھر تک ایک پیسہ فی ہفتہ جمع کرتا رہا تو بمقابلہ اس لڑکے کے جس نے صرف چار مرتبہ میں ایک سو روپیہ جمع کردیئے پیسے جمع کرنے والے کو انعام ملے گا۔ البتہ اگر ایک امیر اور ایک غریب لڑکا باعتبار پابندی وقت کے اور رقم جمع شدہ کے مساوی ہوں تو غریب لڑکے کو اس لیئے ترجیح دی جائے کہ اس کے لیئے پس انداز کرنا مشکل تھا۔

کیش سرٹیفکٹ کے لیئے اگر اُستاد بھی روپیہ جمع کرنے میں شریک ہوجائیں تو اچھا ہے کیوں کہ جب اُستاد کفایت شعاری کے ذاتی فوائد سے واقف ہوں گے تو وہ طلبا کو بھی اس کی ترغیب دیں گے۔

دوسرا طریقہ بچوں میں کفایت شعاری پیدا کرنے کا یہ ہے کہ اسکول میں جو قلم دوات اور کاپیاں اور کتابیں اور دوسرا سامان فراہم ہو وہ سب بچوں کے مشترک سرمایہ سے ہو اور اس کا نفع طلبا میں تقسیم کیا جائے تاکہ طلبا کو کاروبار سے دلچسپی پیدا ہو۔

اُمید ہے کہ منتظمان مدارس اس طریقہ کا رواج جلد سے جلد اپنے طلبا میں جاری کریں گے۔

جن والدین کے بچے ایسے مدرسوں میں پڑھتے ہوں جن میں یہ طریقے جاری نہیں ہیں وہ خود اپنے بچوں کے لیئے گھروں میں گولکیں بنادیں اور ڈاکخانہ میں اُن کے نام سے حساب کھلوادیں اور اُنھیں کے ہاتھ سے داخل کرائیں اور کیش سرٹیفکٹ خریدوائیں اور اس کو تربیت کا ایک لازمی جزو قرار دیں۔ گست ۱۹۳۲ء

(۱۷)

مسلمانوں کی بے نتیجہ محنت

(افسانہ)

آصف پور ایک پرانا اور اجڑا ہوا قصبہ تھا۔ حسن اتفاق سے اُدھر سے ریل نکلی اور چند روز بعد وہاں سے دوسری شاخ نکلنے کی وجہ سے وہ جنکشن ہوگیا اس نواح میں روئی کی پیداوار بہت تھی۔ بس پھر کیا تھا یکے بعد دیگرے روئی کے پیچ بننے شروع ہوگئے تھے کہ چند روز بعد سوت بنانے کی ایک مل بھی وہاں کھل گئی اب وہ روئی اور سوت اور غلہ کی ایک منڈی ہے بازاروں میں تمام مال بھرا پڑا ہے بمبئی سے روزانہ تاروں کا ایک سلسلہ جاری ہے ایک طرف تو تجارت کی یہ چہل پہل ہے لیکن دوسری طرف اسی بستی کے ایک محلے میں شاندار مگر بوسیدہ عمارتیں کھڑی ہیں جن کی مرمت تو درکنار اچھی طرح جاروب کشی بھی نہیں ہو سکتی۔ ان کھنڈروں میں قاضیوں کا ایک پرانا خاندان صدہا سال سے آباد ہے اور اس کے افراد اپنی بوسیدہ بیٹھکوں میں صبح سے آدھی رات گئے تک بیٹھ کر اور حقے پی پی کر اپنا وقت بیکار گزار دیتے ہیں جب خالی باتیں کرتے کرتے جی اکتا جاتا ہے تو ایک شخص بوستان خیال یا طلسم ہوش ربا پڑھتا ہے باقی بیٹھے سنا کرتے ہیں انہیں قاضیوں میں سے ایک صاحب فرحت علی نامی اٹاوہ کی کچہری میں نائوں

نوکر رہے ہیں اور اب پنشن لیکر اپنے وطن آصف پور چلے آئے ہیں۔ اٹاوہ مسلمان بچوں کی تعلیم اور بڑی عمر کے بہی خواہان قوم تیار کرنے کی ایک تربیت گاہ رہا ہی۔ بعض پرانے شریف مگر برباد شدہ خاندانوں کے افراد اپنی قوم کی تباہی اور اپنے گھرانوں کی بربادی سے متاثر ہو کر قومی دردمندی کے مجسمے بن گئے ہیں اور شب و روز مسلمانوں کو قعر ذلت سے نکالنے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ لباس و معاشرت میں یہ لوگ واقعی طور پر مفلس قوم کے نمائندے ہیں۔ ادنی قسم کے لباس اور بلا کنگھے کی داڑھی سے اُن کے جوش ظاہری اور قومی محویت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہی البتہ ان کی خاندانی شرافت کی ایک علامت یہ باقی رہ گئی ہی کہ بے تکلفی کے جلسوں میں جب ان میں سے کوئی فرد تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہی تو اپنے صدر کو مائی لارڈ کے لقب سے خطاب کرتا ہی جس سے اس کا پتہ چلتا ہی کہ اس جماعت کے افراد ایک برباد شدہ نوابی خاندان کے ممبر ہیں۔

آصف پور کے فرحت علی جب تک اٹاوہ میں رہے اس قومی جماعت کے جلسوں میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے اس لیے اپنے وطن میں جب پہنچے تو آبادمنڈیوں اور برباد کھنڈروں کے مناظر و مناظر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک روز قاضی محب الحق صاحب قاضی شہر کی بیٹھک میں بڑا مجمع تھا کہ قاضی فرحت علی اُدھر جا نکلے اور اتنے بہت سے لوگوں کو خالی دیکھ کر جو کچھ ان کے دل پر گزرا اُسے ضبط نہ کر سکے اور موقع پا کر انھوں نے تحریک کی کہ جلسہ کو باضابطہ کر دیا جائے۔ قاضی صاحب شہر کو

صدر قرار دے کر خاندان قضاۃ کی بربادی کے اسباب و علاجات کے متعلق تقریریں ہوں چنانچہ صدر کی منظوری کے بعد سب طرف سے تقاضا ہوا کہ سب سے اول فرحت علی صاحب تقریر کریں چنانچہ آپ نے کھڑے ہو کر ایک گھنٹہ کے قریب تقریر کی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

مائی لارڈ اور شرفاء آصف پور! سب سے اول میں آپ صاحبوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ ناچیز کو ان تکلیف دہ خیالات کے اظہار کا موقع دیا جو میں مدتوں سے اپنے زخم خوردہ دل میں لیئے بیٹھا ہوں آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں کہ اس قدیم قصبہ پر کیسے کیسے دور گزرے ہیں مسلمانوں کی سلطنت کے زمانہ کو جانے دیجیئے خود انگریزی عملداری میں ہمارے خاندان کے منصفوں اور صدر الصدوروں کا ایک سلسلہ رہا ہے مگر اب جو حالت ہماری ہو گئی ہے وہ ہماری اداس صورتوں اور پژمردہ چہروں اور بوسیدہ مکانات کے شکستہ دیوار سے عیاں ہے۔ بظاہر تو ہم لوگ صبح سے شام تک خوش گپیوں اور ہنسی مذاق میں وقت گزار دیتے ہیں مگر اندر ہر وقت ایک قسم کا گھن لگا ہوا ہے جو ہمیں پنپنے نہیں دیتا۔ کیا یہ سب کچھ اس لیئے نہیں ہے کہ ہم اپنے حقیقی فرض سے غافل ہیں۔ اس قصبہ میں بہت دفعہ انجمنیں بنیں، اسکول قائم ہوئے مگر برساتی کیڑوں کی طرح اپنی چند روزہ زندگی پوری کر کے ختم ہو گئے، کاروبار جاری کرنے، تجارت اور صنعت کے انتظامات کرنے کے لیئے بارہا تجربے ہوئے مگر سب ناکام رہے۔ یہ سب کیوں ہے؟ اس لیئے کہ ہم کاہل ہیں۔ ہمت و جرات میں جسمانی

قوت میں خدا کے فضل سے ہم اب بھی دوسری قوموں سے گرے ہوئے نہیں ہیں مگر افسوس کہ استقلال کے ساتھ کسی کام کو انجام تک نہیں پہنچا سکتے اسی قصبہ کی منڈی میں چلے جائیے پندرہ پندرہ برس تک کے لڑکے سیکڑوں ہزاروں کا کاروبار کر رہے ہیں اور صبح سے شام تک روپیہ کمانے میں مصروف رہتے ہیں اور ہم ہیں کہ ہماری بڑی کمائی اب یہ رہ گئی ہے کہ دو چار مہاجنوں میں گشت لگانے کے بعد سو پچاس روپیہ دو روپیہ سیکڑہ سود پر لے آئے جس سے چند روز گزار دیئے اور بمصداق این ہم بعلم اپنے لکھے ہوئے تمسکات اور ان کی ڈگریوں میں بقدر ایک کے اضافہ کر لیا۔ مگر حضرات اب اپنے بچوں پر رحم کیجیے جنھیں دنیائے جدید کی سخت کشمکش کا مقابلہ کرنا ہے۔ انھیں زندگی کے لئے تیار کیجیے۔ خدا کے لئے اپنے خاندان اور اپنے بچوں کی بقا کے لیے کاہلی چھوڑیئے اور کمر بستہ ہو کر کھڑے ہو جائیے اور جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ، خواندہ اور ناخواندہ، عالم اور جاہل مختلف کاروبار میں داخل ہو کر کسب معاش کرتے ہیں آپ بھی وہی طریقے اختیار کر کے کامیابی حاصل کیجیے۔"

فرحت علی صاحب کی پُر اثر تقریر نے حاضرین میں ایک حرکت پیدا کر دی۔ نصف درجن اصحاب یکے بعد دیگرے کھڑے ہوئے اور پر جوش تقریریں کیں ایک نے بچوں کے لیے اسکول قائم کرنے کا مشورہ دیا تو دوسرے نے کپڑے کی کوٹھی کھولنے کی تجویز کی۔ تیسرے نے کہا کہ چار پانچ آدمی مل کر فرنیچر کی دوکان کریں تو چوتھے نے پیش کیا

کہ مٹھائی کی دو دکانیں کھولی جائیں اور قریب تھا کہ ان تجاویز کے لیے کوئی اسکیم مرتب ہو کہ ایک کونے میں سے ایک کوزہ پشت اور کم حیثیت شخص جو دوسرے درجہ کے شیخ زادوں میں سے تھے اور جنھیں ان قلیل الفاظ مجمع میں بولنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا بالآخر ہمت کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور قاضی صاحب صدر سے عاجزانہ الفاظ میں عرض کیا کہ میں تقریر کرنے کی قابلیت تو رکھتا نہیں البتہ میں آپ صاحبوں کو کام کرنے پر آمادہ دیکھ کر ابھی مکان سے ایک مضمون اٹھا لایا ہوں جو حال میں ایک اخبار میں شائع ہوا ہے۔ فرحت علی صاحب نے چونکہ اپنی پہلی تقریر میں اس قصبہ والوں سے کاہلی اور غفلت کو منسوب کیا اس لیے میرا ذہن اس مضمون کی طرف منتقل ہوا جس کا عنوان "کیا مسلمان فی الواقع کاہل ہیں" چنانچہ صاحب صدر کی اجازت سے وہ مضمون پڑھا گیا جو حسب ذیل ہے۔

کیا مسلمان فی الواقع کاہل ہیں

مسلمانوں کی نسبت بعض اصحاب کا خیال ہے کہ وہ اس لیے مفلس ہیں کہ وہ کسب معاش میں کوشش نہیں کرتے اور محنت مشقت سے جی چراتے ہیں اس لیے ہمیں مختلف شعبہ جات زندگی پر نظر ڈالنی ہوگی اسلامی سلطنت کے زمانہ سے مسلمانوں کے بالعموم چار پیشے تھے (۱) زمینداری (۲) نوکری (۳) تجارت (۴) صنعت و حرفت اور کاشتکاری۔

(۱) زمینداریوں کی نسبت متعدد مضامین میں دکھایا گیا ہے کہ وہ عرصہ دراز سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے فرضہ میں نکل رہی ہیں اور ان کے نکلنے کا سلسلہ جاری ہے۔

(۲) نوکریاں اس وقت سے ملنی کم ہو رہی ہیں جب سے کہ تعلیم عام ہو گئی جس سے سب قومیں تعلیم پاکر نوکریاں کرنے لگیں اور نوکری کے لیے علمی سند کی شرط ہو گئی۔ اور بوجہ افلاس کے مسلمانوں کا کثرت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا مشکل ہو گیا۔

(۳) تجارت مسلمانوں کے ایک محدود طبقہ میں تھی اور وہ اس وقت سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل رہی ہے جب سے کہ سود کا کاروبار تجارت کا جزو ہو گیا۔

(۴) صنعت و حرفت میں مسلمانوں کی اب بھی کمی نہیں مگر جب سے سرمایہ داروں نے اس میں ہاتھ ڈالا ہے تجارت کا گودا اُن کے ہاتھوں میں جاتا ہے اور چھلکا کاریگروں کے ہاتھوں میں رہ جاتا ہے۔ اسی طرح کاشتکاری پر بھی سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔

مگر مسلمان باوجودیکہ ہر شعبہ زندگی سے خارج ہو رہے ہیں تاہم معاش کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہیں۔ اگر انھیں ڈپٹی کلکٹری نہیں ملتی تو وہ کلرکیوں کے لیے جملہ دفاتر میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں اور ادنیٰ نوکریاں نہیں ملتیں تو ٹھیکہ داریوں میں تمام تمام دن کھڑے رہ کر مزدوروں سے کام لیتے ہیں۔ کارندہ گیری اور

منشی گری میں گاؤں اور کچہریوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اور مدت العمر کمانے کماتے گھسے اور گھلے جاتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو پسماندگان کے لیئے ایک دن کے سہارے کا سامان نہیں چھوڑتے مسلمانوں میں خاندان کے بزرگ کی مثال بالعموم یہ ہوتی ہی کہ وہ اپنی آمدنی کی مقدار کے اعتبار سے ایک چھتہ پہنے ہوئے ہی جس میں وہ وابستگان کو ڈھکے رہتا ہی۔ اگر آمدنی زیادہ ہی تو یہ چھتہ خوب لمبا چوڑا ہی جس میں دور دور تک کے رشتہ دار سما جاتے ہیں، آمدنی مختصر ہی تو یہ چھتہ مختصر ہی جس وقت یہ بزرگ خاندان دنیا سے رخصت ہوتا ہی اور اُس کے ساتھ اُس کا چھتہ اُٹھتا ہی اسی وقت تمام خاندان ننگا نظر آنے لگتا ہی اور اس کے افراد ستر پوشی کے لیئے ادھر اُدھر بھاگتے پھرتے ہیں جو بچے تعلیم پاتے تھے اور اعلیٰ درجہ کے بورڈنگ ہوسوں میں رہتے تھے اُنھیں وظیفہ اور قرض حسنہ کی تلاش ہوتی ہی جو فارغ التعلیم ہو کر ڈپٹی کلکٹری کے متلاشی تھے وہ کلرکی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بیوہ عورتیں مجبور ہوتی ہیں کہ چند روز بعد ہی جائداد کو مکفول کر کے اپنی زندگی کے دن پورے کریں کیا یہ صرف اس لیئے ہی کہ مسلمان محنت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا رکھتا ہی؟ نہیں بلکہ جو کچھ وہ جان مار کر کماتا ہی اُس سے بچانا اور اُسے بڑھانا نہیں جانتا اور نہ اپنی زندگی میں اپنے وابستگان کو اس کی تعلیم دیتا ہی یہی وجہ ہی کہ اُس کے مرنے پر پسماندگان ننگے کھڑے رہ جاتے ہیں اور دیگر اقوام کے لوگ اسی آمدنی میں زمیندار ساہوکار اور تعلقدار بن جاتے ہیں۔ دوسری قوم کا آدمی ایک خوانچہ میں کچھ چیزیں رکھ کر اس سے اپنے بچوں کی پرورش کر کے کچھ پس انداز کرتا جاتا ہی اور ایک دن

بڑا مہاجن بن جاتا ہی مگر مسلمان اس سے ذلیں گونہ آمدنی ہیں مدت العمر مقروض اور قلاش رہتا ہی اور مفلس مرتا ہی۔ بہر حال زندگی میں مسلمانوں کی کامیابی یا ناکامیابی امر دیگر ہی وہ کوشش اور محنت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتا البتہ مسلمانوں میں ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو بظاہر کچھ نہیں کرتے مگر واقعہ یہ ہی کہ یہ لوگ وہ ہیں جو ہر قسم کی کشمکش کے بعد ناکام ہو کر اور تھک تھکا کر بیٹھ رہے ہیں ایک صاحب ہیں کہ انھوں نے اپنی زمینداری میں خود کاشت کا بھی تجربہ کیا ہی۔ تجارت بھی کی ہی خاص بمبئی سے سامان لا کر دکان بھی کھولی ہی مگر روپیہ کی بازاری اور استعمالی قیمت اور تجارت کے جدید طریقوں سے ناواقفیت کی وجہ سے سب کچھ کھو چکے ہیں اور اب اُن کی بے اعتباری کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہی کہ انھیں دستاویز لکھنے پر بھی روپیہ قرض نہیں ملتے۔ حالانکہ جو مہاجن کبھی اُن کی رعایا میں سے تھا اب اس قدر دولت مند ہو گیا ہی کہ ضرورت کے وقت منڈی میں سے اپنے نوکر کو بھیجکر بلا رسید بیچ کے دس دس ہزار روپیہ منگا لیتا ہی۔ بہر حال اس قسم کے برباد شدہ مسلمان ہر طرف سے مجبور ہو کر حصول زر کے لیے کیمیا اور اکسیر کے نسخوں کی تلاش اور اُن کے تجربوں میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں یا دست غیب اور کشایش رزق کے لیے وظیفے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں یا رمالوں اور پامسٹوں سے وظیفے مقرر کرلتے یا وہاں سے بلاسودی قرضہ ملنے کی کوششوں میں رہتے ہیں۔ غرض کہ جو لوگ آپ کو مسلمانوں میں بیکار یا کاہل نظر آئیں تو اُن کی نسبت ہرگز یہ نہ سمجھیے کہ ان کا دماغ کسب معاش یا حصول زر کی محبت سے

ایک منٹ کیلئے بھی خالی ہو جس کے آثار اُن کے متفکر اور متردد چہروں سے عیاں ہوتے ہیں یہی وجہ ہو کہ جب اُن کے ہاتھ کسی بیوہ یا یتیم کا روپیہ پڑجاتا ہو تو باوجود قریب ترعزیز ہونے کے ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے وہ بلا ارادہ خرچ ہوجاتا ہو اور پھر آستہ وہ ادا نہیں کرسکتے ابتدا میں تو اُن کے دل کو اس سے سخت تکلیف ہوتی ہو اور وہ اس امانت کی ادائگی کے لیے سخت بے چین رہتے ہیں مگر رفتہ رفتہ انھیں اس کی عادت ہوجاتی ہو اور پھر جس صورت سے جہاں سے بن پڑتا ہو اپنا پیٹ پالتے اور تن بدن ڈھکتے ہیں۔ چنانچہ حال کی مردم شماری کی صوبہ متذکرہ کی رپورٹ میں گداگروں۔ جادوگروں۔ آوارہ گردوں کسبیوں اور قیدیوں میں ہندوؤں کی تعداد دولاکھ پانچ ہزار ہو۔ بنسبتی مردم شماری کے اعتبار سے اس مد میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کا چھٹا حصہ یعنی صرف ۳۴ ہزار ہونی چاہیئے تھی مگر وہ دراصل ایک لاکھ ۹۰ ہزار ہو جو تعداد ہندوؤں کے تقریباً مساوی ہو اس حساب سے مسلمان ناجائز پیشوں میں اپنی تعداد کے اعتبار سے ساڑھے پانچ گنے ہیں جو ہمارے نزدیک قابلِ رحم ہو نہ کہ قابل ملامت کیونکہ مسلمان نہیں جانتے کہ اس دُنیا میں زندگی کے دن کس طرح پورے کریں۔"

یہ مضمون سُن کر حاضرین میں کچھ دیر تک ایک سکتہ کا عالم طاری رہا۔ اس کے بعد ایک ٹھیکہ دار صاحب نے اپنی سرگزشت بیان کی اور کہا کہ میں نے محنت کرنے میں مزدوروں کو اور روپیہ پیدا کرنے میں بڑے بڑے مہاجنوں کو مات دی لیکن کمائی کا بڑا حصہ روپیہ والوں کی نذر ہوتا رہا جن سے میں قرض

لیتا تھا۔ اپنا ذاتی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم میں سے بڑے بڑے لوگوں
کا وجود مثل ایک کانچ کے جسم کے ہوتا ہے کہ ذرا سی ٹھیس لگنے، ذرا سے حادثہ
سے چور چور ہو جاتا ہے۔ بہر حال محنت کرتے کرتے میں ختم ہو گیا۔ محض ایک اسٹینیر
کی نادہی سے میرا کاروبار بگڑ گیا اور اب میں بقول مضمون نگار کے تھک تھکا کر
بیٹھ گیا ہوں۔ ٹھیکہ دار صاحب کے بعد یکے بعد دیگرے کئی صاحب کھڑے
ہوئے کسی نے اپنی خود کاشت میں ناکامی کے حالات سنائے کسی نے
تجارت اور دکانداری کے، بالآخر قاضی مختار احمد مرحوم جو اسلامیہ اسکول
کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ رسالہ سود مند ہاتھ میں لیے کھڑے ہو گئے اور
انھوں نے اس کا آخری صفحہ کھول کر پڑھا اور کہا کہ اب زیادہ گریہ و بکا کی
ضرورت نہیں۔ اب کام کرنے کا وقت ہے میں تحریک کرتا ہوں کہ یہاں
بھی فلاح المسلمین کے نام سے ایک انجمن قائم کی جائے اور اس کے ذریعہ
سے بچوں سے لیکر بوڑھوں تک سب کو کفایت شعاری کی تعلیم دی جائے
پھر قاضی مختار احمد صاحب نے سود مند میں سے قواعد فلاح المسلمین پڑھکر
سنائے۔ مقامی حالات کے مطابق کسی قدر ترمیم و اضافہ کے بعد سب نے
انہیں منظور کیا۔ اور قرار پایا کہ روداد کی ایک نقل دفتر سود مند کو بھیجی جائے
قرار دادوں میں سے چند اہم درج ذیل ہیں۔

(۱) سب سے اول ایک انجمن امداد باہمی قائم کی جائے۔ اہل خاندان
میں سے جس کو روپیہ کی ضرورت ہو اسی انجمن سے بازار سے کم شرح پر
قرض لے تاکہ جو کچھ سود دیا جائے اس کا منافع لوٹ کر قرض دار کو حصہ

ہوگا حسب رسد ملے یہ انجمن زیور رکھ کر قرضہ دینے کو ترجیح دے گی۔

(۲) اہلِ خاندان کی ضروریات کے لیئے مشترک سرمایہ سے ایک دکان کھولی جائے جس کی باقاعدہ رجسٹری کرائی جائے۔

(۳) اُن کاریگروں اور دوکانداروں کو خواہ اس انجمن کی طرف سے یا انفرادی طور پر حسب رواج قصبہ قسطوں پر روپیہ دیا جائے۔ مثلاً دس روپیہ دے کر سال بھر میں اُن سے بارہ روپیہ وصول کیئے جائیں اور اس طریقہ سے انھیں دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔

ان قراردادوں کے بعد صاحب صدر کا شکریہ ادا کیا گیا اور جلسہ برخاست ہوا۔ اگست ۱۹۲۵ء

(۱۰)

ترک دنیا

اس زمانہ میں کبھی بعض نیک دل اصحاب نہایت نیک نیتی سے مسلمانوں کو ترک دُنیا کی نصیحت کرتے ہیں اور مال و دولت کی مذمت کرتے ہیں اس ارشاد کے متعلق یہ عرض ہے کہ اب ترک دنیا کے بارہ میں وعظ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اگرچہ مسلمانوں نے تو دُنیا کو نہیں چھوڑا لیکن خود دُنیا نے مسلمانوں کو چھوڑ دیا، اور مقصد حاصل ہوگیا یعنی مسلمان اس قدر نادار و مفلس ہوگئے کہ اب ان میں لاکھوں ایسے ہیں جن کو دو وقت کھانا بھی میسر نہیں

لاکھوں ایسے ہیں جو علم و ہنر سے محروم ہیں اس لیئے بیکار بیٹھے ہوئے اپنے دوسرے بھائیوں کی کمائی کھاتے ہیں یا فاقہ کشی کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو آخر کار مجبور ہو کر کسب معاش کے ناجائز وسائل اختیار کرکے اسلام کو بدنام کرتے اور جیل جاتے ہیں۔

جائدادیں اور زمینداریاں دردسر تھیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کو خواہ مخواہ دُنیوی جھگڑوں اور روپیہ کے معاملات میں مبتلا ہونا پڑتا تھا غنیمت ہی کہ یہ جائدادیں اب اُن کے قبضہ سے نکل نکل کر دنیا دار قوموں کے پاس بڑی تیزی سے جا رہی ہیں اور مسلمان آزاد و فارغ البال ہوتے جاتے ہیں، دُکانداری و تجارت کے جھگڑوں سے وہ پہلے ہی آزاد تھے یہ بنیوں کا کام ہے بھلا ایسی بھی دنیا کی ہوس کیا کہ آدمی دن بھر بازار میں بیٹھا گاہکوں کی چاپلوسی کیا کرے، یا تجارتی کاروبار کے دوسرے مشقت طلب شعبوں میں اپنے آپ کو خراب و خستہ کرے۔

البتہ ابھی دُنیا کی صرف اتنی طلب مسلمانوں میں باقی ہی کہ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے کے لیئے جد و جہد کرتے ہیں اور اُن میں سے کم و بیش دس فیصدی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن حریفوں کو یہ بھی گوارا نہیں، چنانچہ گزشتہ دو تین سال کی مدت میں ترک موالات کے سلسلہ میں کوشش بھی کی گئی کہ مسلمان سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں تاکہ لے دے کر کسب معاش کا جو ایک ذرا سا سہارا باقی رہ گیا ہی وہ بھی نہ رہے چنانچہ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے ایسا بھی کیا اور اس ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ بھگتا۔

(١٩)

مسلمان اور مصارف خیر

آج کل ہمارے علمائے کرام اور دوسرے قومی کام کرنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مسلمان مذہبی و قومی کاموں پر توجہ نہیں کرتے، توجہ نہ کرنے کا یہ مطلب ہے کہ چندہ نہیں دیتے اس وجہ سے ان کی تمام مذہبی و قومی تحریکیں نیم مردہ حالت میں ہیں کیونکہ اس زمانہ میں کوئی تحریک بغیر روپیہ کے سرسبز نہیں ہو سکتی اور روپیہ ملتا نہیں اس لیے کام چلے تو کیوں کر۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مسلمانوں میں ایثار، فیاضی اور قومی و مذہبی احساس نہیں ہے اس بنا پر بعض بزرگ مذہبی رنگ میں صحابہ کرام اور سلف صالحین کی فیاضی و ایثار کے قصے سناتے اور دنیوی لیڈر یورپ کی قومی تحریکوں کی ولولہ انگیز داستانیں بیان کرتے ہیں اور اب چونکہ برادران وطن میں بھی فیاضی کی مثالیں کچھ مدت سے روز افزوں ہیں۔ لہذا یہ واقعات بھی مؤثر طریقہ سے سنائے جاتے ہیں یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے جذبہ فیاضی میں جنبش پیدا ہو اور وہ مذہبی و قومی کاموں کے لیے کچھ دیں تاکہ نیم مردہ تحریکیں سرسبز ہوں اور قدیم و جدید درسگاہیں پُر رونق اور آباد ہو جائیں گویا قوم میں از سر نو ایک حیات تازہ پیدا ہو۔

لیکن ہم بادب گزارش کریں گے کہ مسلمانوں کے متعلق یہ بدگمانی صحیح نہیں مسلمان بہ لحاظ سیرچشمی، فیاضی اور جوش مذہبی کے کسی قوم سے

کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں لیکن ان کے پاس روپیہ ہی کہاں جو دیں، جامہ ندارم دامن از کجا آرم مسلمانوں کا افلاس اب ایک مسلمہ امر ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا کہ وہ دولت مند قوموں کی طرح روپیہ کا دریا بہا دیں گے کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔

ایک طرف ترک دنیا کا وعظ اور مال و دولت کی مذمت، دوسری طرف فیاضی کی ترغیب اور چندہ نہ دینے کی شکایت یہ عجیب ستم ظریفی ہے۔

بے شبہ کہیں جدید مسجدوں کی تعمیر اور کسی جگہ شکستہ مسجدوں کی مرمت کی ضرورت ہے لیکن یہ کام روپیہ پر موقوف ہیں۔ بے شک قومی و مذہبی مدارس جو جدید و قدیم تعلیم کے لیئے قائم ہیں اعانت کے محتاج ہیں لیکن مسلمانوں کے پاس اس قدر سرمایہ کہاں جو ان مدارس کو اعلیٰ پیمانہ پر چلا سکیں۔ فتنۂ ارتداد کا انسداد یقیناً ضروری ہے لیکن یہاں بھی روپیہ کا کھیل ہے اپنی ملکی زبان (اردو) کو ترقی دینے اور تمام ملک میں پھیلانے کی سخت ضرورت ہے لیکن یہ بھی بغیر روپیہ کے ممکن نہیں۔ ملکی سیاسیات میں حصہ لینا بھی ناگزیر ہے لیکن اس کے لیئے تو اور بھی زیادہ روپیہ درکار ہے۔ کم استطاعت مسلمانوں کے بچوں کو تعلیم دے کر ان کو دنیا کے کاروبار کے لائق بنانا کس قدر ضروری ہے لیکن ان کی تعلیم کے لیئے وظائف کہاں سے آئیں غرض ہر کام کے لیئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ روپیہ مسلمانوں کے پاس ہے نہیں یہی سبب ہے کہ اگرچہ مسلمان تمام امور خیر میں اپنی ہمت سے زیادہ صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ دولت کے لحاظ سے ان کو دوسری

قوموں سے کوئی نسبت نہیں۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے تمام قومی و مذہبی کام سرسبز ہوں تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے نکالنے کی کوشش کریں اور ان کو ایسی تدبیریں بتائیں کہ وہ حصول دولت کے جدید وسائل سے متمتع ہوسکیں جب مسلمان دولت مند ہو جائیں گے تو اُن کا کوئی مذہبی اور قومی کام ابتر حالت میں نہ رہے گا۔ بلکہ تمام قوم میں ایک حیات تازہ پیدا ہو جائے گی۔

اگست ۲۵ء ۱۹

---

(۲۰)

آل انڈیا پنجابی سوداگران کی کانفرنس سے ایک سبق

چودھری اشتیاق احمد صاحب سکریٹری انجمن اسلامیہ و گورنر یتیم خانہ بریلی نہایت جوش کے ساتھ مختلف شکلوں میں قومی خدمات انجام دیتے رہتے ہیں وہ بریلی میں پنجابی سوداگران کے چودھری ہیں زمانہ سابق میں پنجابی سوداگران کی ہر مقام پر پنچایتیں قایم تھیں مگر اب سے وہ ٹوٹنے لگی ہیں چودھری صاحب اس امر میں کوشاں ہیں کہ ہر مقام میں پنجابیوں کی اصلاحی کمیٹیاں قایم ہو جائیں اور ایک صدر کمیٹی کسی بڑے مقام میں قایم ہو اس غرض کے لیے چودھری اشتیاق احمد صاحب نے

بریلی، پیلی بھیت، رام پور، نگینہ، میرٹھ اور مراد آباد کے کارکنان کی ایک جماعت لے کر ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۲۵ء کو دہلی میں ایک عام جلسہ بصدارت حاجی محمد اسحاق صاحب بڑے اہتمام سے منعقد کیا گیا جس میں قرار قرار پایا کہ پنجابیوں کی اصلاح کے واسطے ایک آل انڈیا پنجابی کمیٹی قائم کی جائے جس کے مقاصد حسب ذیل ہوں

(۱) برادری میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنا۔

(۲) قوم کو تعلیم، صنعت و حرفت اور کاروباری زندگی کی طرف متوجہ کرنا۔

(۳) قومی اور تجارتی حقوق کی حفاظت کرنا۔

(۴) احکام اسلام کی پابندی کے متعلق قوم کو متوجہ کرنا۔

(۵) برادران قوم کو اپنی ہی برادری میں نکاح کرنے کی ترغیب دینا۔

(۶) آپس کے نزاعات اپنی ہی پنچایت میں طے کرنا۔

(۷) اصلاح معاشرت اور رسم میں فضول خرچیوں کو روکنے کی کوشش کرنا۔

اس کمیٹی کا صدر مقام دہلی قرار پایا اور یہ طے ہوا کہ ایک وفد بغرض حصول و اشاعت مقاصد مختلف مقامات میں دورہ کرے اور کمیٹیاں قائم کرے ممبری کمیٹی کا چندہ ایک روپیہ سالانہ ہو اور اوائل مارچ سنہ ۱۹۲۶ء میں کانفرنس کا ایک بڑا جلسہ ہو ان کاموں کی انجام دہی کے لیئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جس کے صدر حافظ محمد صدیق صاحب ملتان والے سکریٹری شیخ رشید احمد صاحب

اور خزانچی شیخ عطاء الرحمن صاحب قرار پائے۔

اس مفید کانفرنس کے قایم ہونے پر ہم بالخصوص اپنے مخدوم چودھری مشتاق احمد صاحب بریلوی کو اور بالعموم پنجابی سوداگران کو مبارک باد دیتے ہیں اور اُن کی کامیابی کے لیئے دُعا کرتے ہیں مگر اس قدر عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی کاروباری جماعت صدیوں سے کامیابی کے ساتھ تجارت کر رہی تھی اب وہ کون سے اسباب ہیں جن سے وہ کاروباری اور تجارتی میدان سے پسپا ہو رہی ہے۔ زمینداری پیشہ مسلمانوں کی جائدادیں جب قرضہ میں نکل جاتی ہیں، ملازمت پیشہ مسلمانوں کو جب نوکریاں نہیں ملتیں تب وہ تجارت اور صنعت کی طرف توجہ کرتے ہیں اور تاجروں کی دستگیری کے طلبگار ہوتے ہیں مگر تاجروں پر افسوس کہ "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کی مثل صادق آرہی ہے۔ حالات زمانہ اس قدر بدل گئے ہیں کہ مسلمان تاجر نہیں جانتے کہ اپنی حالت کس طرح قایم رکھیں اور سرمایہ داری کے سیلاب کا کس طرح مقابلہ کریں۔

اسی سیلاب سے پریشان ہو کر ہمارے تاجر برادران نے کانفرنس قایم کی ہے مگر جو مقاصد ان صاحب نے دہلی کے جلسہ میں قرار دیئے ہیں وہ تو مسلمان قریبًا اپنے ہر جلسہ میں قرار دیا کرتے ہیں تاہم روز بروز گرتے ہی چلے جاتے ہیں مسلمان دیگر اقوام کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیئے جمع ہو کر باہمی اتفاق قایم کرنا چاہتے ہیں مگر اور زیادہ نفاق بڑھتا ہے۔ صنعت و حرفت کی طرف قوم کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اس

صینہ میں اپنی نسبتی تعداد سے پہلے ہی بدرجہا زیادہ ہیں لیکن سب پریشان حال اور دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام ہیں چھوٹے بڑے دوکانداروں کی مسلمانوں میں کمی نہیں مگر اس زمانہ میں تجارت کا طریقہ بدل جانے سے انھیں قدم قدم پر تجارتی سود دینا پڑتا ہے اور دے نہیں سکتے اور اپنے کاروبار چلانے کے لیے دوسروں کا سرمایہ استعمال کرنے کی وجہ سے ہر دم اُن کے دستِ نگر رہتے ہیں بس جب تک مسلمان اپنے مرض کا صحیح علاج نہ کریں بڑے بڑے جلسے منعقد کرنا، تجاویز پاس کرنا، دورے کرنا، سب کمیٹیاں قایم کرنا سب بیکار ہیں،

مسلمانوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو
اُنھیں اپنا موجودہ سبق بھلانا
اور اُس کی جگہ نیا سبق یاد کرنا پڑے گا

اور وہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر روپیہ کا کاروبار شروع کیا جائے اور مسلمانوں میں تجارتی سود کا عام طور پر رواج دیا جائے مہاجنی کی کوٹھیاں، صرافہ اور ہنڈی کی دوکانیں قایم کی جائیں۔ بینک کھولے جائیں جن کی وساطت سے غیر ممالک سے مال منگایا جائے۔ انھیں ذرائع سے گئی ہوئی تجارت اپنے ہاتھوں میں آئے گی، اور تب ہی برادری میں اتفاق و اتحاد قایم ہو سکے گا، قوم میں تعلیم اور صنعت و حرفت کی ترویج کے وسائل حاصل ہوں گے، احکام اسلام کی پابندی کی طرف طبیعت متوجہ ہوگی اور افرادِ قوم میں حقیقی کفایت شعاری، ایثار، اور دوسری اخلاقی خوبیاں

پیدا ہوں گی، ہمیں امید ہے کہ معزز کارکنان کانفرنس ان طریقوں سے اپنی کارآمد جماعت کو مفید بنا کر دوسرے مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے۔

ستمبر ۱۹۲۵ء

---

(۲۱)

مسلمان آپس میں کیوں لڑتے ہیں

خاص لکچر

وہ لکچر ہے جو ایڈیٹر سود مند نے مسلم کلب لکھنؤ کے زیر اہتمام ۲۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو مسلمانوں کے ایک جلسہ عام میں دیا تھا

مسلمانوں کا طغرائے امتیازہ | مسلمانوں کا طغرائے امتیاز انما المومنون اخوۃ ہے۔ وہ عرب ہوں یا ترک، حبشی ہوں یا مصری، ہندی ہوں یا تاتاری، غرض کہ ایک دوسرے سے خواہ کیسے ہی اجنبی کیوں نہ ہوں وہ اس سے مستثنیٰ ہیں کہ کہیں یکجا ہوں تو اس امر کی ضرورت ہو کہ کوئی تیسرا آدمی ایک دوسرے کی تقریب کر کے آپس میں ملائے۔ وہ السلام علیکم کہکر ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو تو دونوں ساتھ بیٹھ کر بے تکلف مثل حقیقی بھائیوں کے ایک برتن میں کھانا کھا لیتے ہیں۔ نماز کا وقت ہو تو باوجود مختلف العقائد ہونے کے ایک جا نماز پر نماز پڑھ لیتے ہیں

دنیا کے لوگ مسلمانوں کے اس بھائی چارہ پر رشک کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کے مذہب کی برابر کسی میں میل جول اور اتحاد و اتفاق کی قابلیت نہیں ہو۔

زندگی کے لیئے جنگ مگر افسوس کہ یہ اتحاد و اتفاق محض میل جول تک محدود ہو اور یہی مسلمان جب معاملات اور میدان عمل میں آتے ہیں تو اُن کی برابر کوئی قوم آپس میں لڑنے والی نہیں ہوتی۔

یوں تو لڑائی حیات کی ایک علامت ہو و فی العتاب حیوۃ
یعنی لڑائی زندگی ہو چوپایوں میں بھی اور پرندوں میں خاصہ سے زیادہ جو جانور نہیں مگر یہ ہوز ہیں دیکھا ہو گا کہ دو بکریاں کھڑی ہو ہو کر اور پیچھے ہٹ ہٹ کر کس طرح ایک دوسرے کے ٹکریں مارتی ہیں حتیٰ کہ بعضوں کے سینگ لڑتے لڑتے ٹوٹ جاتے ہیں اور دو معصوم فاختائیں لڑتے لڑتے ایسی مدہوش ہو جاتی ہیں کہ اس حالت میں اُن کے پاس پہونچکر پکڑ بھی لو تو انھیں پتہ نہیں چلتا مگر وہی کمزور جانور جب اُن کی نوع پر کسی کا حملہ ہوتا ہو تو متفق اور مشترکا اپنے سے دس گنے تک کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ گاہیں خطرہ کے وقت مل کر شیر کا مقابلہ اپنے کمزور سینگوں سے کرلیتی ہیں۔

اتفاق کی کوشش نفاق بڑھاتی ہی مگر حیرت یہ ہو کہ وہ مسلمان جو سوشل امور میں سب قوموں سے زیادہ متمدن نظر آتے ہیں اپنی نوع اور اپنی موجودہ اور آئندہ نسلوں کی حفاظت کے لیئے متحد نہیں ہو سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو غیر قوموں کی دست برد سے بچانے
انجمنیں دینی اور دنیوی تعلیم دلانے کے لیے انجمنیں بناتے ہیں کمیٹیاں
قایم کرتے ہیں. مگر باوجود اس کوشش کے بالعموم افراد میں اور ان کی
انجمنوں میں مُسابقت سے گزر کر مخالفت ہوجاتی ہے۔ جب یہ مخالفت سے
صریحاً قومی نقصان محسوس ہوتا ہے اور اس امر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ
دوسری قوموں کے مقابلہ میں ایک متحدہ قوت قایم کی جائے اور اس
کے لیے جب کوئی مرکزی تبلیغی جماعت یا آل انڈیا مسلم پارٹیز کانفرنس
منعقد کی جاتی ہے تو وہ اور باہمی رنجش کی موجب ثابت ہوتی ہے اور
باہمی تنازعات سے اور زیادہ قومی نقصان ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے
جو قومیں ایک دوسرے کے ساتھ نہ کھا پی سکتی ہیں حتیٰ کہ ایک دوسرے
کے سایہ سے بھاگتی ہیں اُن کی حالت کو اخبار صدائے مسلم کانپور کے
اڈیٹوریل میں سے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

ہندوؤں کی تنظیم کانگریس اُن کی پارلیمنٹ ہے، ہندو مہا سبھا، برہمو سماج
آریہ سماج، سناتن دھرم سبھا، مارواڑی کانفرنس. گائے کانفرنس، نان برہمن
کانفرنس، ویش کانفرنس، کایستھ کانفرنس اور اب تو اچھوت کانفرنس
سوشل کانفرنس، مزدور کانفرنس، تجارتی ایسوسی ایشن، سائنس کانفرنس،
چمار کانفرنس اور مہتر کانفرنس غرض کہ ہر فرقہ کی کانفرنسیں اور ہر جاتی کا سنگٹھن
موجود ہے۔ اور اگر کلبوں اور ایسوسی ایشنوں کا شمار کرنے بیٹھ جائیں تو ایک اچھی
خاصی ڈائرکٹری تیار ہو جائے ہر شہر اور ہر قصبہ میں متعدد نظام موجود ہیں۔

اُن کے یہاں دان بر محل صرف ہوتے ہیں۔ گئو رکھشا کے نام سے لاکھوں روپیہ فراہم ہوتا ہے۔ بنک سسٹم اُن کے ہاں عام ہے۔ کسی کام کے لیے روپیہ فراہم کیا گیا اور بنک میں جمع کر دیا گیا۔ اس کے سود کی آمدنی سے کام چلایا گیا اس طرح اس کام کے لیے مستقل آمدنی کی صورت نکل آئی۔ اب بار بار قوم کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ برادران ہنود میں ایک اور خوبی ہے وہ یہ کہ ہر شخص اپنے رجحان طبع کے موافق ایک میدان عمل مقرر کر لیتا ہے اور عمر بھر اس کی تکمیل کو مقدم رکھتا ہے۔ دانی کارکنوں میں کوئی تعلیم کو مطمح نظر بنا لیتا ہے تو کوئی مذاہب کو۔ کوئی سیاسیات میں شامل ہو جاتا ہے تو کوئی سوشل اصلاح کو پیش نظر رکھتا ہے۔ کبھی کبھی عام طور پر بھی چندے ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض صوبوں اور بعض ہندو فرقوں میں تو ہر ہر فرد اپنے ذمہ ایک قومی ٹیکس عائد کر لیتا ہے جو بلا ناغہ ادا کر دیا جاتا ہے بلکہ اب تو ہندوؤں کے عوام نے بھی اجتماعی طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ مثلاً لاٹری سسٹم بھی زندہ قوم کے طریقے ہوتے ہیں لیکن یہاں (یعنی مسلمانوں میں) صورت دگرگوں ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں میں کام کرنے والوں کی کمی نہیں۔ البتہ کام کرنے والوں کی بد معاملگی اور رہوس ناکیوں نے اُن کے حوصلے پست کر رکھے ہیں پھر مالی مشکلات کا رونا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ جس وجہ سے ہماری جماعتوں میں اتحاد عمل ناممکن ہو رہا ہے وہ مالی کشمکش ہے آمدنی کی جو مدات مثلاً زکوٰۃ۔ صدقہ۔ خیرات۔ اوقاف اور چندے وغیرہ

کی ہیں۔ وہ محض اس وجہ سے منظم ہوتے ہیں نہیں آپس کہ ہر شہر کی جمعیت اور ہر ادارہ کا متولی سب کچھ اپنے ہی لیئے چاہتا ہے۔ یہی وجہ تھا ہے ماسوا پبلک کا خیال ہے کہ مختلف امور کے لیئے جو زبردست چندے ہوئے ہیں۔ ان رقوم کا بڑا حصہ ہمیشہ "گندم نما جو فروشوں" نے ہضم کر لیا۔ لیکن اس بے سری فوج میں کیا تنظیم ہو جس کا ہر فرد مشکوک ہو اور بھائی کا بھائی پر اعتماد نہیں۔ پبلک یا اجتماعی کام دنیا میں ہی اعتماد اور رواداری پر چلتے ہیں۔ جہاں یہ دونوں باتیں مفقود ہوں وہاں کیا ہو سکتا ہے۔ آہ یہ اُس کی اُمت کا حال ہو جو رسالت ملنے سے پہلے قوم کا امین کہلاتا تھا!!

ہندو مسلمانوں کی تنظیمی حالت صدائے مسلم کی اس بے نظیر تشخیص مرض سے ہندوستان کی مختلف قوموں کے متعلق حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں۔

ہندوؤں میں	مسلمانوں میں
۱۔ بینکنگ سسٹم کی وجہ سے قومی سرمایہ محفوظ ہے۔ مستقل سرمایہ کے سود سے کام چلتا ہے۔ بار بار قوم کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں	۱۔ کام کرنے والوں میں بے مائیگی اور ہوسناکی ہے۔
۲۔ ہر فرد اپنے اوپر قومی ٹیکس عائد کر لیتا ہے اور خود ادا کرتا ہے	۲۔ جو زبردست چندے ہوتے ہیں ان کا بڑا حصہ گندم نما جو فروشوں نے ہضم کیا ہے۔
	۳۔ بھائی کا بھائی پر اعتماد نہیں

ہندوؤں میں	مسلمانوں میں
۳۔ افراد اپنے لیے میدان عمل مقرر کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے تعرض نہیں کرتے۔	ایسی بے سری فوج میں کیا تنظیم ہو جس کا ہر فرد مشکوک ہے۔ باہمی اعتماد اور رواداری نہیں۔
۴۔ مختلف الخیال اور مختلف العقائد لوگوں میں کاموں کی ایک تنظیم ہے۔	۴۔ مالی کشمکش کی وجہ سے اتحاد عمل ناممکن ہو رہا ہے۔ ہر شہر کی جمعیت اور ہر مدرسہ کا متولی سب کچھ اپنے لیے چاہتا ہے۔ یہی وجہ فساد ہے۔

نتائج | صدائے مسلم نے جو وجہ فساد قرار دی ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ افراد سے لیکر انجمنوں تک سب روپیہ کی کمی سے پریشان ہیں جو انجمن قائم ہوتی ہے اُسے سب سے زیادہ روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے مقامی افراد ذاتی افلاس کی وجہ سے اس کی مالی امداد نہیں کر سکتے۔ اس لیے لامحالہ اس انجمن کو اپنی حدود سے باہر جا کر دوسری انجمنوں کے علاقوں میں چندہ مانگنا پڑتا ہے، تب بھی پورا نہیں ہوتا۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے اکثر انجمنیں اپنے یوم ولادت سے ہی آل انڈیا ہونے کا دعوے کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے پرانی انجمنوں سے تصادم اور تصادم سے فساد ہوتا ہے ہندوؤں میں ہر فرد اپنے اوپر قومی ٹیکس عائد کر لیتا ہے اور خود ادا کرتا ہے اپنے لیے میدان عمل قرار دے کر اپنی عمر اس کام کی تکمیل میں صرف کر دیتا ہے مگر مسلمانوں میں جس پر قسمت کے دل میں قومی

خدمت کی لگن پیدا ہوتی ہے اُسے پہلے ہی دن سے گداگری کا پیالہ
ہاتھ میں لینا پڑتا ہے جسے وہ اسلامی ریاستوں، بمبئی، راندیر، کلکتہ، رنگون
میں لیے لیے پھرتا ہے۔ وہاں دوسرے قومی گداگروں کی ہشت مشت اور
گالی غیب ہوتی ہے۔ وہاں سے جو کچھ جھپٹ کر لاتا ہے اُسے بنک میں رکھکر
اُس سے مستقل آمدنی پیدا کرنے کی بجائے چند روز میں قومی کاموں میں صرف
کر ڈالتا ہے اور کچھ عرصہ بعد گداگری کے لیے نکلنے پر مجبور ہوتا ہے وہ گداگری
کے پیشہ میں ناکام ہے تب تو اس کی زندگی تلخ ہے ہی لیکن اگر وہ کامیاب
بھی ہے اور کام چلانے کے لیے اُسے کافی روپیہ مل رہا ہے تو یا تو بقول
مدعیانِ مسلم وہ گندم نما جو فروش بن کر چندے ہضم کرتا ہے اور اگر وہ
دیانتدار ہے تو اُس کے بھوکے بھائی بند قومی خدمت کے بہانے سے
اس انجمن میں دخیل ہو کر یا ملازم ہو کر اس روپیہ سے مستفید ہونا چاہتے
ہیں اور جب اس میں رکاوٹ ہوتی ہے تو فساد کرتے ہیں اخبارات
میں مضامین لکھتے ہیں۔ بڑے بڑے پوسٹر لگاتے ہیں کارکنوں کو
بدنام کرکے ملک میں اُن کے خلاف ناراضی پھیلاتے ہیں غرض کہ مسلمان
تباہ حالت ہوں یا بدنیت، دیانت دار ہوں یا بددیانت، قومی
خیرخواہ ہوں یا بدخواہ، قوم کے عام افلاس کی وجہ سے سخت کشمکش اور
باہمی تنازعات میں مبتلا ہیں۔

افراد میں اختلاف کی وجہ | جو کچھ عرض کیا گیا قومی انجمنوں اور
قومی کاموں کا حال ہے اسی پر مسلم افراد کو قیاس کر لیجیے کہ جو لوگ فی ال

ضروریات کی فکروں میں شب و روز لگے رہتے ہیں اُن کے دماغ میں دوسروں کی بھلائی کا خیال کیسے سما سکتا ہے۔ ہر شخص واقف ہے کہ جب ملک میں قحط پھیلتا ہے اور بھوک کی شدت ہوتی ہے تو کتنے آدمی بلا لحاظ مذہب و ملت کے اپنے بچوں کو بھون کر کھا جاتے ہیں۔ گویا افلاس اور ضرورتمندی جس قسم کی شقاوت قلبی انسان میں پیدا کرتی ہے دنیا کی کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتی جب دو قومیں ملک گیری یا کسی دوسری نفسانی خواہش سے ایک دوسرے سے لڑتی ہیں تو اُن کے آداب میں یہ داخل ہے کہ مریضوں عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے چھوڑ دیں مگر بھوک وہ بلا ہے کہ تمام تہذیب آداب اور مذہبی احکام تک کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور انسان میں بدترین قسم کی عداوت اور بغض کو جاگزیں کر دیتی ہے۔

خود غرضی فساد کی بنیاد ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو تمام فسادات کی بنیاد خود غرضی پر ہے اور صاف ظاہر ہے کہ خود غرضی زیادہ تر ضرورتمندی کا نتیجہ ہے اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ دو شکم سیر افراد کے سامنے دنیا کی نعمتیں پڑی رہیں تو انھیں اُن کی طرف رغبت نہ ہوگی اور بھوکوں کے درمیان سوکھا ٹکڑا بھی پڑا ہوگا تو اُس کے لیے وہ ایک دوسرے کی جان لینے تک پر آمادہ ہو جائیں گے بس اسی پر ہمارے قوم کے افراد کو قیاس کر لیجیے کہ جب افراد میں ضرورتمندی زیادہ سے زیادہ ہے تو فطری قوانین کی رو سے زیادہ سے زیادہ خود غرضی اور زیادہ سے زیادہ باہمی

فساد ہونا لازمی ہے جیسا کہ ہر مقام پر موجود ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں اپنی قوم کی نسبت یہ شکایت سنتا ہوں کہ ہمارے افراد میں ایثار کرنے والے اُن اقوام سے کہیں کم ہیں جنھیں ہم خسیس اور ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو ایسی قوموں میں ایثار کیسے پیدا ہو سکتا ہے جن کا اثاثہ محدود یا نادار ہو اور ضروریات غیر محدود ہوں۔ غیر محدود اس لیے کہ دنیا بھر کے تکلفات مسلمانوں کی ضروریات میں داخل ہیں۔ جو لوگ ناداری کی وجہ سے بھوکوں مرتے ہیں وہ تو خیر کسی شمار میں نہیں مگر سوال یہ ہے کہ جن لوگوں کو کہیں سے کچھ مل جاتا ہے اُن کا بھی نصب العین کیا ہے؟ ان کا نصب العین ہے لذیذ سے لذیذ کھانے کھانا اور عمدہ سے عمدہ کپڑے پہننا اور اعلیٰ سے اعلیٰ زندگی بسر کرنا اور یہ سب کچھ قرض لیکر اور قرض بھی سودی، جو انجام کار تمام موجودات کو ختم کر جاتے۔

پچھلے چالیس پچاس سال مسلمانوں کے اس کوشش میں گزرے ہیں کہ جب یہ علوم پڑھ کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے حاصل کریں مگر جب اعلیٰ عہدے دار دس دس ہزار روپیہ ماہوار کما کر صرف یہ کہ قوم کی مادّی مدد نہیں کیا کر سکتے بلکہ اخراجات سے خود پریشان رہتے ہیں تو صحیح طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ

کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست۔

عیش پرست قومیں کفایت شعار نہیں | اوّل تو مسلمان طبعاً مسرف واقع ہوئے ہیں۔ سو اتفاق سے ان کے پیش نظر تمدن انگلستان کا

جو دُنیا کی سب سے زیادہ دولت مند قوم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اہل یورپ اور اہل انگلستان بڑے عیش پرست ہیں۔ اگر تمدنی سطح کے اعتبار سے دیکھو تو بے شک وہ بڑے عیش پرست ہیں۔ لیکن اگر اُن کی مادی ثروت کے اعتبار سے دیکھو تو وہ نہایت کفایت شعار ہیں۔ ہم اپنے برادرانِ وطن کو بھی بڑا خسیس سمجھتے ہیں مگر گرمیوں کے موسم میں آپ پہاڑوں پر جاکر دیکھئے تو کون لوگ وہاں کے مکانوں اور بنگلوں کو ہوٹلوں اور کلبوں کو لئے ہوئے ہیں اور کون لوگ وہاں زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کرتے ہیں؟ اس کا جواب ملے گا ہمارے برادرانِ وطن! جو اپنی آمدنی کا ایک ادنیٰ جزو تفریح اور آرام میں صرف کر دیتے ہیں اور وہ ہمیں اسراف اور عیش پرستی معلوم ہوتی ہے اور ہم اپنی غلطی سے سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ تمدن دورِ جدید کا لازمی جزو ہے۔

مگر حضرات! وہ اعلیٰ تمدن جو خوش نصیب اقوام نے اختیار کر رکھا ہے وہ اُن کی دولت کے مقابلہ میں خواہ کیسا ہی حقیر کیوں نہ ہو تاہم اس کی مضرت سے وہ لوگ بھی نہیں بچ سکتے۔

اعلیٰ تمدن کا اثر تجارت پر اور وہ مضرت یہ ہے کہ جب ادنیٰ طبقہ کے لوگ امرا کو دیکھ کر زیادہ گراں زندگی بسر کرنے لگتے ہیں تو اس سے شرحِ مزدوری بڑھ جاتی ہے اور کارخانوں میں گراں مال تیار ہوتا ہے جو دُنیا کے بازاروں میں اُن ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو سستا مال تیار کرتے ہیں۔ آپ صاحبوں کو یقیناً معلوم ہوگا کہ اہلِ جاپان اقتصادی

اتنا ارزاں مال بناتے ہیں کہ وہ دوسرے ممالک میں جاکر وہاں کے کارخانوں کو شکست دیتا ہے۔ چنانچہ اس وقت خود انگلستان اور ہندوستان کی کپڑوں کی ملوں پر جو مصیبت آرہی ہے وہ سب جاپان کے سستے مال کی بدولت ہے۔

اہل جاپان کی خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ علوم وفنون اور سائنس اختیار کرنے میں وہ سب سے آگے ہیں مگر تمدن کے اعتبار سے وہ ابھی بہت پیچھے ہیں سنتا ہوں کہ وہ لوگ اب تک میز کرسی اور جدید قسم کا فرنیچر استعمال نہیں کرتے بلکہ زمین پر نشست رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ سادہ سے سادہ زندگی بسر کرکے زیادہ سے زیادہ ارزاں مال تیار کرسکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جو افلاس ہیں لاجواب ہے اور جس کی نسبت عام طور پر لکھا جاتا ہے کہ یہاں ۷۰ فی صدی آبادی کو صرف ایک وقت کھانا ملتا ہے، مزدوروں کو کارخانوں میں کام مل جاتا ہے تو وہ ہوٹلوں میں اچھے کھانے کھاتے۔ چاء اور برف پیتے۔ سگریٹ اور شربت نوشی کرتے ہیں، تھیٹروں، تماشوں میں اپنا روپیہ ضایع کرتے ہیں اور چار دن مزدوری نہ ملے تو سڑک پر بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔

جرمنوں کی سادگی کا نتیجہ اہل جاپان کو جانے دیجیے جن کی ترقی ابھی چالیس پچاس برس سے شروع ہوئی ہے اور جو تمدن میں بہت پیچھے ہیں آپ جرمنوں کو دیکھیے جو یورپ کی سربرآوردہ قوموں میں سے ہیں پچھلی جنگ میں جب انھیں شکست ہوئی اور انھوں نے کثیر نقصانات اٹھائے

توکل قوم نے اپنی مالی حالت کی درستی کے لیے اس یکجہتی کے ساتھ کوشش شروع کی جو مسلمانوں کا کوئی ایک خاندان بھی نہیں کرتا۔ اہل جرمن کی نسبت سُنا ہی کہ اُنھوں نے یک قلم جملہ تکلفات ترک کر دیے۔ کھانے کے اوقات گھٹا دیے۔ ڈنروں اور لنچوں کو جن میں بڑے ٹھاٹھ ہوتے تھے بالکل اُڑا دیا۔ جو لوگ ہزاروں روپیہ کھانے پینے میں صرف کرتے تھے اُنھوں نے ملک کے نفع کے لیے سوکھے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرنی شروع کر دی۔ صبح صبح اُٹھے جیب میں بسکٹ ڈبل روٹی ڈال کر کام پر چلے گئے دن میں جب بھوک لگی جیب میں سے دو ٹکڑے روٹی کے نکال کر آتش شکم کو ٹھنڈا کر لیا اور چند روز میں اس کا نتیجہ دکھا دیا۔

نتیجہ یہ ہی کہ اُنھوں نے اس قدر کم قیمت فرنیچر تیار کیا کہ اسے اہل انگلینڈ اپنے دارالامرا کے لیے خریدنے پر مجبور ہوئے۔ اور اب تجویز درپیش ہی کہ دارالعوام کے لیے بھی جرمنی کا سستا فرنیچر خریدا جائے جس کی مخالفت انگلستان کے تاجر بڑے زور سے کر رہے ہیں۔

ہمارا نصب العین پس ای حضرات! جب انگلستان جیسا دولتمند ملک اعلیٰ تمدن لے ہاتھوں پریشان ہی تو اہل ہند۔ اور ان میں بھی غریب ناکارہ مسرف مسلمانوں کا کہاں ٹھکانا ہوگا۔

حضرات! بعض صحاب کو میری تحریک کی نسبت غلط فہمی ہوتی ہی اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ دولت کما کر مثل اہل یورپ کے عیش کریں۔ حالانکہ میرا

میرا نصب العین یہ ہے کہ مسلمان کم سے کم خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کریں اور اپنی ذات پر نہیں بلکہ اپنی قوم پر زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کریں۔ ہمارا نصب العین حالی کے یہ چند اشعار ہیں

جانتے ہو اک عزیز دوستاں جس نے کیا ۔ اس پہ کرلیا قناعت ان کا جو بس کیا ہم
گو کہ ہر افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا ۔ حق میں لیکن قوم کے یارو یہی خصلت ہے سم
تن پہ تھا فاروق اعظم کے پھٹا کرتا ٹاٹ کا
قوم کی خاطر بھری تھی لیکن بیت المال ہم

برادران وطن کی سادگی

آپ صاحبوں میں غالباً اکثروں کو اس امر سے اتفاق ہوگا کہ اس وقت ہمارے برادرانِ وطن میں اکثروں کا ان اشعار پر عمل ہے میں ان کے ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت کے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ چنے چبا چبا کر ننگے بدن رہ کر سخت سے سخت زندگی بسر کرکے جو کچھ پس انداز کرتے ہیں۔ اس سے پیاؤ قائم کرتے۔ کنوئیں بنانے دھرم سالے تعمیر کرانے اور درس گاہوں کے لیے بڑے بڑے اوقاف قائم کرتے ہیں۔ میں نے غریب ترین پنہاریوں یعنی رسوئی کرنے والی عورتوں کو دیکھا ہے کہ انھوں نے تمام عمر کا پیسہ پیسہ جمع کیا ہوا اثاثہ بجائے حلوے اور مٹھائیاں کھانے اور اپنے لیے پختہ مکان بنوانے کے عوام الناس کے لیے کنواں بنوانے میں صرف کردیا۔ ہر شہر میں ادھر ادھر گھومنے سے اس قسم کی فیاضیوں کی نظیریں بکثرت ملیں گی جن کا مقابلہ ہماری قوم کے وہ تعلیم یافتہ حضرات بھی

عام طور سے نہیں کر سکتے جو ہزاروں روپیہ ماہوار کماتے ہیں۔

مسلمان تعلیم یافتہ لوگوں میں سے وہ شخص اپنے آپ کو کامیاب سمجھتا ہے جس نے مدّت العمر کی کمائی میں جدید طرز کا پختہ مکان بنوا لیا ہو اور جس نے سول لائنس میں کوئی کوٹھی تعمیر کرا لی ہو۔ اس کی خوش نصیبی کی تو کوئی حد و انتہا ہی نہیں کیوں کہ جس قسم کے کرایہ کے بنگلوں میں وہ بوجہ اپنے عہدے کے دوران ملازمت میں رہتا رہا۔ اسی قسم کے مکان میں بعد پنشن کے رہنا نصیب ہوا اور بس۔ گویا یہی زندگی کا مال کار تھا۔

برخلاف اس کے ہمارے برادران وطن میں کار خیر جاری کرنے والوں کی صدہا نظیریں موجود ہیں۔ حال میں اخبارات میں آپ نے مسٹر گنگا رام صاحب انجینیر کے حالات پڑھے ہوں گے جنھوں نے طلبا کی تعلیم کے لیئے اور انھیں مختلف محکمہ جات کے لیئے تیار کرنے کی غرض سے ایک بڑا وقف قایم کیا ہے اور سب سے بڑا کام جو انھوں نے اپنی کمائی کے روپیہ سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس ہزار ایکڑ بنجر زمین کو گورنمنٹ سے ٹھیکہ پر لے کر اس میں تیس لاکھ روپیہ لگایا اور وہاں پانی پہونچا کر اسے اس قابل بنا دیا کہ اس سے تیس ہزار آدمیوں کی خوراک پیدا ہوئے یہاں سے کمیروں / خدمت گاروں اور تاجروں کو ملا کر ایک لاکھ آدمیوں کی پرورش کا انتظام ہو گیا ہے اور اس بنجر قطعہ آراضی کی قیمت کا تخمینہ چار پانچ کروڑ کے درمیان کیا جاتا ہے یہ مقام پنجاب میں ہے۔

اس کام کو اگر ذاتی بھی قرار دیا جائے تب بھی اپنے نفع کی وسعت کے لحاظ سے اس کا شمار ہر طرح پر بہترین قسم کے پبلک کاموں میں ہو سکتا ہے کیونکہ اگر ہر ملک میں چند افراد ہی اپنا کمایا ہوا روپیہ زمین کو اس طرح کارآمد بنانے میں لگائیں تو کل ملک تھوڑے سے عرصہ میں آباد، خوش حال اور گلزار بن جائے اور کروڑوں آدمی خود دارانہ زندگی بسر کرنے لگیں۔ مگر اس قسم کے مفید کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے جذبات پر قدرت رکھتے ہیں اور اپنی ذات پر کم سے کم صرف کرتے ہیں۔

اصلاح رسوم میں مسلمان کیوں ناکام ہیں

اب سوال یہ ہے کہ مسلمان اپنی ذات پر کم سے کم کس طریقہ پر صرف کریں بعض اصحاب کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو اس امر کی طرف توجہ نہیں ہے۔ مگر میرا ذاتی خیال اس کے خلاف ہے۔ میں بچپن سے سنتا آیا ہوں کہ مسلمان شادیوں اور مراسم میں بہت خرچ کر کے تباہ ہوتے ہیں۔ ایک زمانہ میں علماء دین کا یہ مشن رہ چکا ہے کہ وہ اپنے وعظوں اور تقریروں میں کم خرچ کرنے اور خلاف شرع رسوم بند کرنے کی نصیحتیں کیا کرتے تھے ان علماء کرام کے اثر سے عرصہ تک شادیاں اس طرح ہوتی تھیں کہ جمعہ کی نماز کے بعد نکاح پڑھا دیا جاتا اور دلھن کو اسی وقت معمولی کپڑوں میں رخصت کر دیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ تک یہ ہا مگر رفتہ رفتہ پھر وہی مسرفانہ رفتار قائم ہو گئی اور واعظ اور ناصح خود گرد و پیش سے مغلوب ہو کر زیادہ صرف کرنے لگے اُن میں سے جو فارغ البال

اور خوش حال ہیں وہ اپنے بچوں کی شادیوں میں مثل جہلا کے ہزاروں روپیہ صرف کرتے ہیں۔ اگرچہ رفتہ رفتہ مسلمان اس قدر مفلس ہوتے جاتے ہیں کہ انھیں شادیوں میں زیادہ صرف کرنے کی استطاعت ہی نہیں رہی۔

کفایت شعار مسلمانوں کا انجام

بہرحال اس کی وجہ کیا ہے کہ باوجود ان احساسات کے ہم مسرف ہیں اور ہم سے اسراف نہیں چھوٹتا؟ نہ چھوٹنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ ہم بچاتے ہیں اس کا صحیح مصرف ہمیں نہیں معلوم بلکہ بچایا ہوا روپیہ ہمارے لیے وبال جان ہو جاتا ہے اس لیے مجبور ہو کر ہم اسے صرف کر ڈالتے ہیں۔ تھوڑے روپیہ کی ہر وقت جائداد نہیں مل سکتی۔ وہ کبھی موقع سے ملتی ہے۔ زیور کی شکل میں رکھیں تو ہر شخص کی اس پر نظر پڑتی ہے۔ بالخصوص جب کہ عام سوسائٹی ہی مغرور ہو تو چند افراد کے زیوروں پر بُری ہی نظریں پڑتی ہیں۔ پھر یہ کہ زیور کی وجہ سے عزت آبرو خطرہ میں رہتی ہے اور اس کی وجہ سے حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ روپیہ کو زمین میں دفن کر دیا جائے اس سے اول تو روپیہ بیکار پڑا رہتا ہے جس سے روپیہ والے کا حوصلہ نہیں بڑھتا۔ اور اس کا خیال بھی نہ ہو تو بالعموم دفینہ کا انجام یہ ہوتا ہے کہ عزیز و اقارب حتیٰ کہ خود اولاد تھوڑا تھوڑا روپیہ نکال کر ختم کر دیتی ہے۔ کاش اس طرح نکالا ہوا روپیہ کسی کار آمد مصرف میں لگے تب بھی کچھ تو مفید ہو۔ مگر وہ بالعموم عیاشی میں ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے بعض دفینہ والوں کو دیکھا ہے کہ وہ اس کی حفاظت کے لیے راتوں جاگتے ہیں اور

جاگنے کے لیئے افیون کھانے لگتے ہیں۔ غرض کہ جو لوگ مسلمانوں میں روپیہ بچا کر رکھتے ہیں اُن کی مٹی بھی مسرفوں سے کچھ کم خراب نہیں ہوتی۔ اور یہ سب کچھ صحیح نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

زیادتی دولت سے امریکہ کی پریشانی | صحیح نصب العین یہ ہے کہ بیں انداز کیا ہوا پیسہ بھی ایک منٹ کے لیئے بیکار نہ رہے بلکہ کسی نفع آور کام میں لگے۔

ہمارے ملک میں دیگر ممالک کا کروڑوں، اربوں روپیہ تجارت اور کارخانوں میں لگا ہے۔ پچھلے دنوں جب امریکہ میں دولت کی افراط ہوئی تو وہاں کے عقلا کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اگر کچھ دنوں یہ روپیہ ملک میں ٹھہر گیا تو افراد قوم مُسرف اور عیش پرست ہو جائیں گے جس سے انجام کار ملک کی تباہی ہوگی۔ اس لیئے اہل امریکہ نے جلد سے جلد بہت سا روپیہ دیگر ممالک کو قرض دے دیا۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ یورپ و امریکہ سے روپیہ آکر تو یہاں آٹھ آنہ سیکڑہ پر قرض دیا جاتا ہے اور خود ہمارے ملک کا روپیہ یہاں دو اور تین روپیہ سیکڑہ ماہوار پر چلتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنی کمائی صرف کر ڈالنے کے بعد ہر دم ذاتی ضرورت کی وجہ سے ہر شرح سود پر قرض لینے کو تیار رہتے ہیں۔ اس لیئے ملک کا زیادہ تر روپیہ مسلمانوں کی بد (لت) و غیر نفع آور کاموں میں لگا رہتا ہے گویا مسلمان ہی زیادہ تر اس ملک میں تباہی کے ذمہ دار ہیں جو نہ صرف یہ کہ اپنا کمایا ہوا روپیہ نفع آور

کارخانوں میں نہیں لگاتے بلکہ دوسروں کا روپیہ بھی سود یا ربو پر لے کر صرف
کر ڈالتے ہیں اور اس طرح ملک کی حقیقی ترقی میں مانع ہیں۔ غرض کہ مسلمان اگر
یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسراف سے بچیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ اپنا کمایا ہوا روپیہ
براہ راست نفع آور کاموں، بنکوں اور روپیہ کے کاروبار میں لگائیں
بغیر روپیہ کے کاروبار میں شرکت کے تجارت اور صنعت محض فرضی اور
خیالی الفاظ ہیں، کیونکہ کوئی تجارت اور صنعت بغیر سرمایہ کے قائم
نہیں رہ سکتی اور تجارت و صنعت تو بڑی چیزیں ہیں مسلمانوں میں روپیہ
کا کاروبار نہ ہونے کی وجہ سے افراد میں، عزیزوں میں، احباب میں، قوموں
میں اس درجہ رقابت، رشک و حسد، رنجش اور عداوت ہے جس کی نظیر
دنیا کی کسی قوم میں مشکل سے مل سکے گی

ہماری بربادی کی اصلی وجہ

یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ دوسری قومیں ہماری
دشمن ہیں اس لیئے ہم تباہ ہوئے
ہیں قومیں ہمیشہ سے ایک دوسرے کی دشمن بھی رہی ہیں اور دوست
بھی جب مسلمان ابتدا میں کمزور تھے تب انہیں تمام دنیا دشمن نظر
آتی تھی اور تب واقعی دوسری قومیں مسلمانوں کی دشمن ثابت ہوتی
تھیں۔ کیوں کہ بوجہ اپنی قوت کے اور مسلمانوں کے ضعف کے وہ
مسلمانوں کو نقصان پہونچا سکتی تھیں جب مسلمانوں کی قوت بڑھی تو
انہیں دشمن قوموں میں سے بعض قومیں مسلمانوں کی دوست ہوگئیں
اس کے بعد نظام عالم کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان بکھر گئے

ہوگئے اور اب انھیں دنیا بھر دشمن نظر آنے لگی۔ اب اس کا علاج
یہ نہیں ہو کہ ہم دنیا کی قوموں کو دشمن سمجھ کر انھیں کوسا کریں اور گالیاں
دیا کریں یا کسی قوم کی چاپلوسی کر کے اُس کے دوست بنانے کے خیال
میں تضیع اوقات کریں یہ سب کمزوری کی علامتیں ہیں۔ صحیح طریقہ یہی ہو
کہ جن ذریعے سے دیگر اقوام قوت حاصل کر رہی ہیں ہم انہیں سمجھ کر انہیں ذرائع
سے قوت حاصل کریں۔ اب تو ہماری مثال بالکل اُن لوگوں کے مانند ہو
جو کسی گہرے کھڈ میں جا پڑے ہیں۔ اب اوپر سے کوئی شخص ایک ڈھیلا بھی
پھینک دیتا ہو تو وہ نیچے والوں کے گولی کی طرح لگتا ہو یا کشش ارضی
کی وجہ سے کوئی پتھر اوپر سے لڑھک کر آتا ہو تو وہ سمجھتے ہیں کہ اُسے اوپر
چلنے والوں نے دانستہ پھینکا ہی۔ اس کے جواب میں کھڈ والے جو پتھر زور
لگا کر اوپر والوں پر پھینکتے ہیں وہ الٹا لوٹ کر خود انھیں پر گرتا ہی۔ پھر
یہ کہ جو لوگ اوپر کی صاف ہوا میں رہتے ہیں وہ چست و چالاک ہیں
خوب بھاگتے ہیں۔ دوڑتے ہیں۔ اور سُرخ و سپید بنے ہوئے ہیں اور یہ
لوگ نیچے کی زہریلی ہوا میں ہر چند ہاتھ پاؤں مارتے ہیں مگر ان سے چار
قدم نہیں چلا جاتا اس حالت کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ ہم میں قوت نہیں ہی
اُس کے حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی ورزشیں کرتے ہیں جو انھیں اور زیادہ
تھکا کر بیدم اور کمزور کئے دیتی ہیں۔ پھر ایک شخص ان میں سے کہتا ہی
کہ پرانی قسم کی ورزشیں بیکار ہیں۔ جدید قسم کے ڈمبل کی ورزش کرو۔ کچھ
لوگ اُس سے اختلاف کرتے ہیں اور کچھ اُس کی پیروی کرتے ہیں۔ مگر دونوں کی

کوششوں کا نتیجہ ہیچ ہے اور تیسرا شخص آکر ایسی ورزش بتاتا ہے جس میں کچھ نئی اور کچھ پرانی ورزشیں ہیں اور جن سے بدیہی طور پر اوپر رہنے والے لوگ زیادہ تنومند بنتے چلے جاتے ہیں۔ مگر کھنڈ والوں کے لیئے یہ بھی قطعاً بیکار ثابت ہوتی ہے پھر ان میں سے کوئی تیسرا شخص اور نیا طریقہ تجویز کرتا ہے جس کی بڑی مخالفت ہوتی ہے اور سب کا نتیجہ روز افزوں کمزوری اور نفاق وشقاق کی زیادتی ہوتا ہے اور یہ کمزوری اور نفاق بند بیچ بڑھتے رہیں گے جب تک کہ وہ لوگ اس سمی ہوا سے نکل کر تازہ ہوا میں نہ داخل ہوں جو طبیعت کو اُبھارنے دوران خون بڑھانے اور جسم میں حقیقی قوت پیدا کرنے والی ہے سمی ہوا افلاس و اسراف ہے۔ اور صحت بخش ہوا اسرمایہ ہے جس کے بغیر کسی قوم کا صحیح طور پر نشوونما نہیں ہوسکتا۔ اور جس کے بغیر قومی ترقی کی کوئی تدبیر کارآمد نہیں ہوسکتی۔

نومبر ۱۹۲۵ء

---

(۲۲)

مسلمانان پنجاب کی اقتصادی حالت

یہ وہ لکچر ہے جو سید طفیل احمد صاحب نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے گزشتہ سالانہ جلسہ میں دیا تھا اور جس کو انجمن حمایت اسلام نے کثیر تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا۔ یہ لکچر بعض اخبارات میں بھی شایع ہوچکا ہے مگر ناظرین سودمند کے لیئے خاص طور پر اس جگہ درج کیا جاتا ہے تاکہ مسلمانوں کی اقتصادی

حالت کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات سود مند کی جلدوں میں یکجا جمع ہو جاسکے)

تمہید میرے لیئے یہ باعث فخر و مسرّت ہو کہ مجھے آج اس صوبہ کے مسلمانوں کو خطاب کرنے کا موقع ملا ہو جہاں کے مسلمان بہ لحاظ تعداد، تعلیم، تموّل جسمانی قوت اور جرأت و مردانگی کے نیز بقول سرسید مرحوم بلحاظ اپنی "زندہ دلی" کے دوسرے صوبوں کے مسلمانوں سے ممتاز ہیں۔ موجودہ حالت میں مسلمانان پنجاب نہ صرف اپنے صوبہ میں نہایت جوش، سرگرمی، اولوالعزمی سے قومی و تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ ان کی سعی و عمل کے نتائج سے دوسرے صوبوں کے مسلمانان بھی مستفید ہوتے ہیں۔ چنانچہ علاوہ آپ کی دیگر امدادوں کے حال میں مجھے صوبہ متحدہ کی انجمن جمعیت تبلیغ سے معلوم ہوا کہ اس کی مالی امداد میں پنجاب کا بڑا حصّہ ہو لہذا یہ قدرتی امر ہو کہ تمام ہندوستان کے مسلمان آپ کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھیں اور اگرچہ ہجوم و افکار و مصائب میں اصلی اعتماد تو خداوند تعالےٰ کی ذات پر ہونا چاہیئے لیکن اس مادی دُنیا اور عالم اسباب میں مصیبت کے وقت مسلمانان ہند کی نظریں آپ ہی پر پڑتی ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ لیکن ای بزرگان پنجاب اس تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہو جو نہایت مایوس کن ہو آپ ذرا اس کمزور اور نحیف الجثہ شخص کی مایوسی اور دلی رنج و کلفت کا اندازہ کیجیئے جو اپنے جواں مرد اولوالعزم اور بلند بالا بھائی کے خون میں بھی وہی مہلک جراثیم دیکھتا ہو جنھوں نے خود اس کی

جسمانی نشو ونما کو روک دیا ہے اور اس کو پژمردہ اور مضمحل بنا رکھا ہے
ضعیف الجثہ بھائی سے میری مراد دوسرے صوبہ کے مسلمان ہیں جو اپنے
قوی ہیکل پنجابی بھائیوں کو اپنے جیسے امراض میں مبتلا دیکھ کر افسردہ
و مایوس ہیں۔ اے بزرگو! یہ مہلک جراثیم "افلاس و تنگدستی" کے ہیں
جنھوں نے کم و بیش پنجاب کے مسلمان بھائیوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے حالانکہ
یہاں قانون انتقال اراضی کا عرصہ سے نفاذ ہے جس کی وجہ سے خصوصیت
کے ساتھ مسلمانوں کی جائدادیں جو عموماً زیر بار رہتی ہیں محفوظ ہیں۔ شاید یہ
ایک بدنما بات ہوگی کہ ایک پُر مسرت و ولولہ انگیز جلسہ میں جہاں دور
دراز کے مسلمان اپنی محبوب انجمن کی مالی امداد اور کام کرنے والوں کی حوصلہ
افزائی کے لیے آئے ہیں مسلمانوں کے افلاس اور بے مائیگی کی داستان سُنا کر
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را، کا مصداق بنوں مگر اے حضرات ایک لمحہ تامل
کیجیے۔

۳۔ دودھ والی گائے کے چارہ کا انتظام

میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم روزانہ جس گائے کا دودھ دُہتے ہیں اس کے چارہ اور دانہ کی بھی فکر رکھیں تاکہ دودھ خشک نہ ہو جائے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ جن مسلمانوں
کی اعانت کی بدولت تمام قومی کام چل رہے ہیں ہم کو اُن کی مالی اور
اقتصادی حالت پر بھی توجہ کرنی چاہیے اور اس کی ترقی کے لیے بہترین
تدابیر اختیار کرنی چاہییں تاکہ مسلمان آئندہ بھی نہ صرف قومی کاموں میں
امداد دینے کے قابل بنے رہیں بلکہ اس قدر متمول ہو جائیں کہ اُن کا ایک ایک فرد

ایک ایک قومی انسٹی ٹیوشن کو اپنی ذاتی اعانت اور فیاضی سے چلا سکے اور قومی کارکنوں کو روز روز کے چندوں اور دریوزہ گری سے مستغنی کردے۔ ایسا ہونا کچھ ناممکن نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مثالوں سے قطع نظر کرکے صرف ہندوستان ہی کی مثالوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ غیر مسلم اقوام میں ہزاروں افراد ایسے ہیں جنہوں نے محض اپنی ذاتی فیاضی، اولوالعزمی، بلند حوصلگی سے بڑے بڑے شاندار کام اپنی قوم کے لیئے جاری کر رکھے ہیں اور اس قسم کی فیاضیوں کی مثالیں معمولی معمولی قصبات تک میں موجود ہیں اور یہ نتیجہ اس بات کا ہے کہ اُس قوم کے افراد دولتمند ہیں اس لیئے وہ ہر موقع پر فیاضی اور اولوالعزمی کا اظہار کرتے ہیں لہذا اُن کے تمام قومی کام سرسبز وشاداب ہیں۔ لیکن مسلمانوں کے تمام قومی کام اُن کی بے مائگی اور ناداری کی وجہ سے پژمردہ اور افسردہ حالت میں ہیں۔

شروع میں میں نے پنجاب کے مسلمانوں کی مالی حالت پر جو اظہار طمانیت کیا اس سے مقصد یہ تھا کہ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی نسبت اُن کی حالت فی الجملہ بہتر ہے لیکن اگر برادران وطن سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو اُن کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں بلکہ لائق صد حسرت و افسوس ہے۔

۴۔ اخبارات سے اقتباس | اس کا پتہ کچھ تو اخبارات سے چلتا ہے اور کچھ سرکاری رپورٹوں سے۔ اول اسلامی اخبارات سے کچھ اقتباسات پیش کرونگا مثلاً اخبار وکیل نے ایک مرتبہ امرتسر کے مسلمانوں کے متعلق لکھا تھا کہ "اگر تم کسی مسلمان محلہ میں چلے جاؤ تو تم اُن تنگ و تاریک گلیوں میں عجیب وحشت ناک خاموشی پاؤگے

اور اس خاموشی کا طلسم توڑنے کے لیے یا تو کسی برہنہ و نیم گرسنہ بچے کی چیخ و پکار سنو گے یا کبھی برقع پوش عورت کے نحیف و لاغر ہاتھ دیکھو گے جو برقع سے نکل کر خیرات کے لیے پھیلے ہوں گے"۔ دوسرے موقع پر لکھا تھا "علی الصباح جب دنیا کی قومیں اپنا کاروبار انجام دینے کے لیے بیدار ہوتی ہیں تو کانوں میں اللہ اکبر کی جرنیلی صداؤں کے ساتھ گداگروں کی آہیں پیدا کرنے والی دردانگیز آوازیں بھی آتی ہیں جو حساس دلوں کو بے چین کیے بغیر نہیں رہتیں۔ یہ گداگر کون لوگ ہیں۔ ذرا تحقیق کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ننانوے فی صدی مسلمان ہیں۔ ان میں بچے بھی ہیں بوڑھے بھی ہیں۔ یہ دل خراش نظارہ سارا دن اور بہت رات گئے تک آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ آہ یہ حقیقت کس قدر افسردہ کرنے والی ہے کہ مسلمان ہر شعبہ زندگی میں گداگری پہ مجبور ہیں" اسی طرح حال میں امرتسر کے مظلوموں کی فریاد کے عنوان سے ایک عرضداشت شائع ہوئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ "امرتسر کے اہل ہنود تاجر اور صاحب ثروت ہیں اور مسلمان عام طور پر غریب اور مزدوری پیشہ ہیں۔ اہل ہنود نے سنگھٹن قائم کرکے اپنی قوم کو منظم کیا جس کی غرض یہ تھی کہ مسلمانوں کا بائیکاٹ کیا جائے اور اس طرح سے کمزور کرکے اور دباؤ ڈال کر یا لالچ دے کر پرستاران توحید کو مرتد بنایا جائے"۔

ایک عام مقولہ ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کی دولت اور اپنی عقل زیادہ معلوم ہوتی ہے ممکن ہے کہ اس قول کے مطابق مسلمانوں کو اپنی دولت کم معلوم ہوتی ہو مگر مسلمانوں کے واقعی افلاس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اب تک

برادران وطن کبھی نہ صرف اپنے دلوں میں مسلمانوں کو مفلس سمجھتے ہیں بلکہ علانیہ اپنے اخبارات میں اُن کے متعلق اس کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ اخبار کیسری میں لالہ دونی چند صاحب کی ایک تحریر شایع ہوئی تھی جس کے چند الفاظ یہ ہیں :۔

"ہندوؤں کے پاس ایک طاقت ہے اور وہ طاقت روپیہ کی طاقت ہے جس سے وہ فوائد عظیم حاصل کر سکتے ہیں۔ انفرادی اور مجموعی حیثیت سے ہندو مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ دولتمند ہیں پنجاب کے تقریباً ہر ایک قصبے میں اگر ایک مسلمان ایسا ہے جس کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے تو اس کے مقابلہ میں ایک لاکھ روپیہ رکھنے والے بیس ہندو ہیں"

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کی اعلیٰ معاشرت اور ظاہری ٹھاٹھ سے لالہ صاحب کو یہ حسن ظن پیدا ہوا کہ قصبات میں بعض مسلمانوں کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہروں میں بھی بہت کم مسلمان ایسے نکلیں گے کہ جن کے پاس نقد ایک لاکھ روپیہ ہو۔ بہرحال برادران وطن ہماری مالی کمزوری سے کم و بیش واقف ہو گئے ہیں جس سے اُن میں یہ اولوالعزمی پیدا ہو گئی کہ وسیع پیمانہ پر انھوں نے شدھی کا کام جاری کر دیا۔ چنانچہ لائل گزٹ نے ایک بار لکھا تھا کہ "ملکانہ راجپوتوں کا ارتداد تمام مسلمانوں کے ارتداد کی تمہید ہے" اور ایک تقریر میں پنڈت نرسنگھ دیو صاحب شاستری پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے فرمایا تھا کہ :۔

ہندو جاتی پھر اپنی بلند جگہ حاصل کرے گی وہ وقت آنے والا ہے

> جب کہ اس دیش کے تمام غیر ہندو پھر ہندو بن جائیں گے
> اور اُن کے دھرم استھانوں پر ویدک دھرم کا جھنڈا
> لہرا سکے گا"

خدا نہ کرے ایسا کبھی ہو اور ہونا نہ ہونا دونوں خدا کے اختیار میں ہیں
تاہم ان اقتباسات کے پیش کرنے سے میری غرض یہ ہے کہ ایک طرف تو افلاس و تنگدستی سے پست ہمتی اور افسردگی پیدا ہو رہی ہے دوسری طرف کثرت تعداد سے حوصلہ ہمت اور اولوالعزمی بڑھ رہی ہے اور چونکہ حیات ملی کے لیے افسردگی سم قاتل ہے اور ہمت و مردانگی مثل حرارت غریزی کے ہیں تو کیا مسلمانوں کا یہ سب سے اہم فرض نہیں ہے کہ وہ دیگر تدابیر کے ساتھ قومی جسم کی حرارت غریزی قائم رکھنے کی بھی فکر کریں۔

۵۔ تعلیم پر افلاس کا اثر اب تک مسلمانوں نے اپنے تمام قومی امراض کا علاج تعلیم کو سمجھا اور اسی میں ترقی کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کیں اور کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو جملہ قومی امراض کے لیے اکسیر کا کام دیتی ہے مگر اب جو دقت پیش آ رہی ہے وہ یہ ہے کہ کافی تعداد میں اکسیر بھی خریدنے کی ہمت مسلمانوں میں نہیں رہی یعنی یہ کہ قوم کے بچے کثیر تعداد میں اسکول کی تعلیم ختم کر کے اعلیٰ تعلیم اس لیے حاصل نہیں کر سکتے کہ اُن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ اپنے اس خیال کی تائید میں ذیل کے اعداد پیش کرتا ہوں:-

تعداد طلبا سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں

نمبر ترتیبی	نوعیت	تعداد مسلمان طلبا	تعداد ہندو و سکھ طلبا	مسلمانوں کی نسبت بلحاظ ہندو و سکھ طلبا
۱	پرائیویٹ یا نجی درسگاہیں	۳۴،۲۶۳	۲۳،۰۰۹	۱½
۲	ابتدائی مدارس	۱،۸۲،۲۷۶	۱،۶۱،۶۳۴	۱⅛
۳	ثانوی مدارس	۱،۰۰،۳۵۶	۱،۴۳،۹۸۳	۷/۱۰
۴	ٹریننگ، ڈاکٹری، انجینیری، صنعتی و تجارتی اسکول	۵،۱۲۳	۶،۹۱۶	۵/۷
۵	مختلف علوم کے کالج	۱،۰۸۳	۳،۶۸۸	⅓ سے کم
۶	قانون، ڈاکٹری، مویشی، ٹریننگ، تجارتی کالج	۱،۴۱۱	۴،۶۵۵	⅓ سے کم

مندرجہ بالا نقشے سے ظاہر ہے کہ مسلمان بچوں کی تعداد ابتدائی تعلیم میں برادران وطن سے زیادہ ہے لیکن اوپر کے درجوں میں بتدریج گھٹتی چلی جاتی ہے حتےٰ کہ کالجوں میں ایک ثلث سے بھی کم رہ گئی ہے اور میرے نزدیک یہ بہت کچھ افلاس کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ عمدہ قسم کی یونیورسٹیاں جن میں صنعتی، انجینیری اور ڈاکٹری تعلیم کا انتظام ہو قایم کرنے کی استطاعت مسلمانوں میں بالکل نہیں ہے جن کی اس زمانہ میں سخت ضرورت ہے اور جن کی اہمیت اس درجہ پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ اب سائنس اور صنعتی تعلیم کے مقابلہ میں علوم عامہ کی تعلیم ایسی ہی بیکار سمجھی جاتی ہے جیسے کہ مشرقی علوم کی تعلیم کسی زمانہ میں انگریزی مدارس کی تعلیم کے

مقابلہ میں سمجھی جاتی تھی اور اسی وجہ سے انجمن حمایت اسلام مجبور ہوئی ہو کہ وہ اپنے کالج میں سائنس کا شعبہ کھولے جس میں کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔

۶۔ لکھے پڑھے لوگوں کے پیشے وقت تنگ ہو اس لیئے میں اور زیادہ تعلیمی اعداد سنا لینے یا ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ شمار کرا لینے میں آپ کا قیمتی وقت صرف نہ کروں گا کیونکہ ان امور کا چرچا تو اخبارات وغیرہ میں رہتا ہے۔ البتہ چند وہ پیشے جو مسلمانوں سے مخصوص تھے ان میں مسلمانوں کی تعداد دکھانا ضروری سمجھتا ہوں۔

الف۔ قانون

	وکیل مختار، قاضی	محرر، عرایض نویس وغیرہ
مسلمان	۲,۲۸۹	۲,۸۳۵
دیگر اقوام	۷,۰۱۲	۶,۴۳۴

گویا کہ قانون پیشہ اصحاب میں بشمول عرایض نویسوں اور محرروں کے مسلمان صرف ایک ثلث ہیں۔

ب۔ ڈاکٹری وطب

مسلمان	۲۵,۹۴۴
دیگر اقوام	۲۲,۶۸۳

ڈاکٹری اور طب کی تعداد رپورٹ میں یکجائی دی گئی ہے۔ ڈاکٹری میں یقینی طور پر دیگر اقوام کے افراد بہت زیادہ ہیں۔ طب کے پیشہ میں کسی قسم کی روک نہیں ہو اور اس میں علوم جدیدہ کی ضرورت نہیں ہو اس لیے مسلمانوں کی تعداد اس میں اس قدر زیادہ ہو کہ اس نے کل خانہ میں ان کی تعداد دیگر اقوام سے کسی قدر بڑھادی۔

ج۔ تعلیم | مگر اسی کے ساتھ صیغۂ تعلیم میں جو مسلمانوں کا خاص پیشہ تھا مسلمان کم ہیں۔

	پروفیسر اور دیگر استاد	کلرک وغیرہ
مسلمان	۲۱,۶۲۲	۹۰۶۱
دیگر اقوام	۳۰,۴۸۴	۲,۱۰۰

د۔ علوم وفنون | مردم شماری کی رپورٹ میں ایک مد علوم وفنون یعنی
Letter Arts & Science
کی ہے۔ اس مد کی تفصیلات اس اعتبار سے قابل توجہ ہیں کہ اُن میں اعلٰے درجہ کے کاموں میں مسلمان کم اور ادنیٰ درجہ کے کاموں میں زیادہ ہیں اُنکی تفصیل یہ ہے:۔

	مسلمان	دیگر اقوام	
۱۔ محاسب خزانچی	۸,۸۹۲	۱۷,۹۸۸	نصف
۲۔ کلرک اور ٹائپ کرنے والے	۵۹۶	۱,۱۷۳	نصف
۳۔ انجنیر سرویر وغیرہ	۲,۰۸۴	۴,۳۶۶	نصف
۴۔ مصنف اخبار نویس نقاش مصور وغیرہ	۱,۶۶۸	۲,۱۳۹	نصف
۵۔ ڈراما نویس گویئے ایکٹر ناچنے والے	۵۲,۷۵۵	۸,۳۱۱	چھ گونے
۶۔ عامل رمال منجم بھاٹ وغیرہ	۳,۰۲۸	۱۲,۳۷۷	چہارم

یعنی محاسبوں، کلرکوں، انجنیروں، مصنفوں، اخبار نویسوں نقاشوں اور مصوروں میں مسلمان دیگر اقوام سے نصف ہیں۔ مگر ڈرامہ نویسوں گویوں

اکابٹروں اور ناچنے والوں میں مسلمان دیگر اقوام سے ساڑھے چھ گونے
ہیں۔ رمّال منجم اور بھاٹ صرف ہندوؤں میں ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں
ہندوؤں کا زیادہ تعداد میں ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

۷۔ دوسرے پیشے | اس ملک میں مسلمان یا تو زیادہ تر زمیندار تھے یا ایسے
پیشوں میں تھے جن میں لکھنے پڑھنے کا کام تھا۔ زمینداری سے تو وہ اس لیے خارج
ہو رہے ہیں کہ اسراف بدنظمی اور قرض داری میں ان کی جائدادیں نکل رہی ہیں
اور لکھنے پڑھنے کے کاموں میں اور ملازمتوں میں اس لیے کم ہو رہے ہیں کہ اس
زمانہ کی تعلیم جو روپیہ سے حاصل ہوتی ہے اس کی مسلمانوں میں استطاعت
نہیں اور اسی لیے وہ شور و شغب کرتے رہتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تعلیمی
اور سیاسی کمزوری کی وجہ سے جب مسلمان ملازمت اور زمینداری سے خارج
ہو رہے تھے تو وہ ملک کے دوسرے پیشوں کی طرف توجہ کرکے انھیں اپنی بسر
اوقات کا ذریعہ بناتے۔ مگر واقعات بتا رہے ہیں کہ دیگر پیشوں کا لازمی عنصر
سرمایہ ہے جس سے مسلمانوں کو سراسر اجنبیت ہے۔ اس لیے دوسرے پیشوں
میں ان کی کامیابی کی راہ میں تعلیم اور ملازمت سے بھی زیادہ موانع حائل ہیں۔
بلاشبہ اس صوبہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر پیشہ
میں کثرت سے نظر آتے ہیں مگر افسوس کہ سرمایہ کی کمی سے وہ طبقۂ اسفل
میں اترتے چلے جاتے ہیں برخلاف اس کے دوسری قومیں طبقۂ اعلیٰ میں
چڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ مثلاً معمولی قسم کی زراعت میں مسلمانوں کی تعداد
دیگر اقوام سے زیادہ ہے مگر چائے قہوہ ربڑ اور نیل کی کاشت میں جو زیادہ

قیمتی ہیں اور جن میں زیادہ سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے دیگر اقوام کے ۳،۸۴۰ افراد کے مقابلہ میں مسلمان صرف ۲۹۰ یا آٹھ فی صدی ہیں۔

مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ مال تیار کرنے میں وہ دیگر اقوام سے آگے مگر تجارت سے نفع اٹھانے میں پیچھے ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ حسب ذیل اعداد سے ہو سکے گا۔

الف۔ تیل

	تیل نکالنے والے	تیل بیچنے والے
مسلمان	۱،۳۴،۶۲۹	۱،۸۴۰
دیگر اقوام	۲،۳۸۸	۶،۰۸۸

یعنی مسلمانوں میں تیل نکالنے والوں کی تعداد دیگر اقوام سے اٹھاون گونہ اور تیل بیچنے میں ایک ثلث سے بھی کم ہے۔

ب۔ کپڑا

	کپڑا بننے والے	کپڑا بیچنے والے
مسلمان	۵،۰۸،۹۱۳	۳۳،۰۸۰
دیگر اقوام	۲،۴۷،۰۸۸	۸۶،۹۳۰

یعنی کپڑا بننے میں مسلمان دوگنے سے زیادہ مگر اسے بیچ کر اصلی نفع اٹھانے میں نصف ہیں۔

ج۔ لوہا

	لوہے کا کام کرنے والے	لوہے کا سامان بیچنے والے
مسلمان	۱،۶۳،۳۹۳	۸۶۵
ہندو	۷۵،۷۶۳	۷۶۰۳

یعنی ہتھوڑا بجانے میں مسلمان دوگنے سے زیادہ ہیں مگر لوہے کی تجار

نفع اُٹھانے میں آٹھویں حصہ سے بھی کم ہیں۔

۷ شراب

مسلمانوں میں شراب کشی اور شراب فروشی دونوں یکساں ممنوع ہیں۔ مگر آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ شراب کشی اور تمباکو گانجہ تیار کرنے میں مسلمان دوسروں سے چوگنے اور شراب فروشی میں جس میں سوڈا لیمنیڈ کی دکانیں بھی شامل ہیں مسلمان ایک ثلث ہیں تفصیل حسب ذیل ہے:-

	شراب کشی	افیون گانجہ تمباکو بنانا	شراب فروشی مع سوڈا لیمنیڈ
مسلمان	۱۵۴۳	۲۹۵	۱۸۴۰
دیگر اقوام	۳۰۱	۱۳۸	۴۰۸۸

یہی حال سود کی داد و ستد میں ہے جس کی نسبت انجمن ہائے امداد باہمی کے ایک افسر سے مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب کے مسلمان ساڑھے بارہ کروڑ روپیہ سالانہ سود میں دیتے ہیں۔ مگر سود لینے میں بمنزلہ نفی کے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جن کاموں کو وہ ناجائز سمجھتے ہیں ان میں سے بھی چھانٹ کر ایسے کام اختیار کرتے ہیں جن میں نفع کی کوئی صورت نہ نکلتی ہو۔

۸ صنعت و تجارت کا تعلق

میں چاہتا تھا کہ صنعت اور تجارت کے اعداد جدا جدا دکھاتا مگر ان دونوں شعبوں میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ایک کا دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے ایک بڑا دولت مند شخص ایک عظیم الشان کارخانہ قایم کر کے اس میں مال بھی تیار کر سکتا ہے اور اس کی بکری کا انتظام بھی کر سکتا ہے یعنی اگر دولت کی

افراط ہو تو صنعت اور تجارت دونوں ایک ساتھ چل سکتی ہیں مگر مسلمان چوں کہ غریب ہیں اس لیئے وہ بالعموم دونوں میں سے صرف ایک کام اختیار کر سکتے ہیں، اور وہ بھی ادنیٰ قسم کے۔ برخلاف اس کے دیگر اقوام کے لوگوں کو بوجہ سرمایہ دار ہونے کے یہاں اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ بذات خود مال تیار کرنے کی تکلیف اُٹھانے کے قصے میں پڑیں وہ اپنے روپیہ کے زور سے غریب کاریگروں کے مال پر قابض ہو کر ہر وقت اُس سے تجارت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مسلمان کاریگروں کی تعداد زیادہ اور تاجروں کی تعداد کم ہے۔

جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے معلوم ہوگا۔

	صنعت و حرفت میں	تجارت میں
مسلمان	۲۶,۰۳,۷۸۰	۴,۱۹,۳۰۴
دیگر اقوام	۲۲,۳۰,۴۶۸	۱۳,۰۳,۳۲۶

یعنی مسلمان، صنعت و حرفت میں بقدر چار لاکھ کے زیادہ ہیں مگر تجارت میں دیگر اقوام سے ایک ثلث سے بھی کم ہیں۔

۹ اعلیٰ اور ادنیٰ تجارتوں میں مسلمانوں کا تناسب

اس کے علاوہ مسلمانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالعموم اعلیٰ تجارت میں کم اور ادنیٰ میں زیادہ ہیں مثلاً جواہرات وغیرہ کی تجارت میں مسلمان نصف سے کم، انگریزی دوافروشی۔ رنگ روغن پیٹرول وغیرہ کی تجارت میں ایک ثلث سے کم مگر چیتھڑوں کی تجارت میں

پانچ گونہ سے زیادہ ہیں۔

۱۰۔ ادنیٰ کاری گری البتہ اکثر ایسے پیشے بھی ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو۔ مثلاً قالین اور کپڑا بننے والے فرنیچر تیار کرنے والے، آتش بازی بنانے والے، مگر یہی لوگ وہ ہیں جو واقعی طور پر سرمایہ داروں کے غلام ہیں، وہ اپنا مال تیار کرنے کے لیے تمام سامان، سرمایہ داروں سے اُدھار لاتے ہیں جو گراں ملتا ہے اور اس پر سود دیتے ہیں اور مقروض ہونے کی وجہ سے اپنا تیار کردہ مال بھی اپنے مہاجن کو دینے پر مجبور ہوتے ہیں جو اونے پونے دام لگا کر اُن سے کل مال کھو لیتا ہے اور آئندہ کام چلانے اور کھانے پینے کے لیے غریب کاری گر پھر اُسی سے قرض لاتے ہیں اور مدت العمر وہ قرضداری کے دائرہ میں مثل کولھو کے بیل کے چکر لگاتے رہتے ہیں۔

۱۱۔ ساہوکاری انھیں غریب کاری گروں اور دوکانداروں کے خون سے دیگر اقوام میں مہاجنوں ساہوکاروں اور کوٹھی والوں کی جماعت مرتب اور تیار ہوتی ہے جن کے ہاتھوں میں تمام ملک کی صنعت و تجارت ہے۔ پنجاب میں جو لوگ روپیہ کا کاروبار کرتے ہیں یا مہاجنی کوٹھیوں سے دلالی وغیرہ کا تعلق رکھتے ہیں ان کی تعداد حسب ذیل ہے:-

مسلمان	۱۲,۱۱۷
دیگر اقوام	۱,۵۳,۵۰۲

یعنی اس میں مسلمان صرف بارھواں حصہ دیگر اقوام کا ہیں بارھواں حصہ بھی محض اس لیئے ہی کہ اس میں دلال شامل ہو گئے جو دکانداروں کو ساہوکاروں سے قرض دلاتے رہتے ہیں ورنہ اس میں مسلمان بالکل نفی ہیں ہوتے۔

۱۴۔ کارخانہ داری مسلمانوں کو جب سب طرف سے دھکے ملتے ہیں تو انھیں شوق ہوتا ہی کہ اپنے بچوں کو دستکاری اور صنعت و حرفت سکھائیں مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہی مسلمان کاری گروں کی تعداد پہلے ہی کچھ کم نہیں بلکہ زیادہ ہی مگر جب تک کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں کارخانے کثرت سے نہ ہوں محض کاری گروں کی کثرت تعداد سے کیا فائدہ ہوسکتا ہی۔ مردم شماری کی رپورٹ میں کاری گروں کی تعداد ذاتوں کے اعتبار سے بھی دی گئی ہی اور چوں کہ مسلمانوں میں شیخوں کی اور ہندوؤں میں کھتریوں کی تعداد زیادہ ہی اور دونوں شریف ہیں اس لیئے کاری گری اور کارخانہ داری میں دونوں کی تعداد کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ذات	مردم شماری	کاری گر	مالکان کارخانہ	مہتمان کارخانہ
کھتری	۳۹۳۰۰۰	۳,۰۹۲	۳۰۱	۳۲۹
شیخ	۲۵۶۰۰۰	۶,۲۲۴	۵۵	۶۰

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہی کہ باوجود سے کہ شیخ تعداد میں کھتریوں سے کم ہیں تاہم کاری گروں میں اُن سے دوگنے اور ملکیت کارخانجات میں پانچویں

سے بھی کم ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سرمایہ اُن کے پاس نہیں اور جب تک کہ سرمایہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ آئے گا وہ ہزار کوششیں کریں محنت کرتے کرتے ختم ہو جائیں تجارت و صنعت کا صرف چھلکا اُن کے پلّے پڑے گا اور گودا سرمایہ دار اقوام کے ہاتوں میں جاتا رہے گا۔

۱۴۔ صنعت و سرمایہ کا تعلق میں نے ایک بار مسلم آؤٹ لک میں صنعت و حرفت کے متعلق ایک نہایت ٹھوس اور مختصر مضمون دیکھا تھا اُس کا خلاصہ یہ تھا کہ صنعت کے تین اجزاء ترکیبی ہیں۔

(۱) انجنیر (۲) کاریگر (۳) سرمایہ

انجنیر سے مراد موجد سے ہے۔ انجنیر تیار ہونے کی صورت یہ ہے کہ یا تو طلبا کو وظائف دے کر صنعتی تعلیم کے لیے غیر ممالک کو بھیجا جائے۔ ورنہ ہندوستان میں عظیم الشان کارخانے اور صنعتی یونیورسٹیاں Technological Institute, قایم کر کے اُن میں یورپ اور امریکہ سے ماہر انجنیر بلائے جائیں جو یہاں کے طلبا کو کام سکھائیں۔ ان دونوں کاموں کے لیے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کارخانے چلانے کے لیے سرمایہ لازمی چیز ہے۔ مگر چوں کہ مسلمان مفلس ہیں اس لیے انجنیر اور سرمایہ دونوں ان کی دسترس سے باہر ہیں اب صرف تیسرا جزو یعنی کاریگر باقی رہ جاتے ہیں جن کی اُن میں پہلے ہی کمی نہیں۔ اُن کی تعداد بڑھا کر یہ توقع کرنا کہ ملک کی

صنعت وحرفت مسلمانوں کے ہاتوں میں آجائے گی اس کی مثال بالکل اس شخص کی مانند ہے جسے راستہ میں گھوڑے کا ایک پرانا نعل پڑا مل گیا تھا اُس نے کہنا شروع کیا کہ بس اب صرف تین نعل اور ایک گھوڑے کی کسر باقی ہے۔

۴۔ اوّل پیشے حاصل کرنے کا مشورہ مگر جو لوگ مسلمانوں کی اصلی حالت سے واقف ہیں وہ اب بھی صنعت وحرفت کو مسلمانوں کی دسترس سے باہر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک بڑے آدمی کا خیال ہے کہ اول مسلمان ڈاکٹری، انجینیری اور قانون کے پیشوں کو اختیار کرکے دولت جمع کرلیں اور جب دولتمند ہوجائیں گے تب وہ وقت صنعتی وحرفتی تعلیم کے لیئے زیادہ مناسب ہوگا کیوں کہ اُس وقت ہم اس قابل ہوں گے کہ کارخانے اور تجارتی کوٹھیاں کھول سکیں مگر دقّت یہ ہے کہ اس زمانہ میں قانون، طب اور انجینیری بھی بغیر روپیہ کے نہیں حاصل ہوسکتیں اور اسی وجہ سے مسلمان ان پیشوں میں روز بروز کم ہورہے ہیں حالاں کہ پہلے زمانہ میں یہ سب پیشے مسلمانوں سے مخصوص تھے۔ بہر حال ان پیشوں یا ملازمتوں سے جب تک کہ مسلمان اتنا کما پائیں گے کہ وہ سرمایہ دار تجارتی بن سکیں تب تک تو قوم پر "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مُردہ شود" کی مثل صادق آجائے گی۔

۵۔ گداگری ممکن ہے کہ بعض اصحاب کے دلوں میں یہ خیال گزرے کہ اگر ملک کی تجارت وصنعت اور سرمایہ داری میں ہمارا حصہ نہ ہوگا تو

ہم مرتو نہ جائیں گے۔ اگر ہم سوسائٹی کے اعلے طبقہ میں نہیں ہیں تو ادنی ہی میں ہی۔ ہمارا دین و ایمان سلامت رہنا چاہیئے اور بس مگر کاش اسی پر بس ہوتی اور جہاں ہم ہیں وہیں رہتے۔ رونا تو یہ ہی کہ ادنی پیشوں میں اور سرمایہ داروں کی غلامی میں بھی ہمارا قایم رہنا مشکل ہو رہا ہی۔ بلکہ ہم افلاس کی وجہ سے اس سے بھی نیچے کے درجے میں اُتر رہے ہیں اور ہمارا دین و ایمان بھی خطرہ میں پڑ رہا ہی۔ چنانچہ مردم شماری کی رپورٹ کے اس خانہ میں جس میں گداگروں، اور آوارہ گردوں، کسبیوں اور قرموں کی تعداد قوم وار دکھائی گئی ہی مسلمانوں کی تعداد دیگر اقوام سے بدرجہا زیادہ ہی۔ وہ اعداد حسب ذیل ہیں:۔

	مسلمان	دیگر اقوام
(۱) گداگر اور آوارہ گرد	۴۳۸,۹۵۷	۱,۵۱,۵۷۵
(۲) قرّم و کسبیاں	۱,۷۹۶	۲۵۹

یعنی مردم شماری میں مساوی یا کسی قدر زیادہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی تعداد گداگروں میں تین گونی اور قرّموں اور کسبیوں میں سات گنی ہی۔

ایک نہایت افسوسناک امر یہ ہی کہ اس خانہ میں مسلمان شرفا کی تعداد جس میں شیخ، سید، مغل، پٹھان شامل ہیں ہند و شرفا کے مقابلہ میں بدرجہا زیادہ ہی۔

البتہ خیرات لینے والوں کی ایک مد میں مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو

زیادہ ہیں اور یہ سادھوؤں اور درویشوں کی جماعت ہی جو تیرتھ کا ہوں میں اور دھرم سالوں اور معبدوں میں رہتی ہی اور جس کی تعداد ہندوؤں میں بمقابلہ مسلمان درویشوں اور فقرا کے تین گونی ہی۔ یہ لوگ ضرورت مند گداگروں سے بالاتر ہیں اور اہل ہنود میں وہ نہایت خوش حال ہیں۔ ان کی زیادتی دولت اور زیادتی تعداد کی بڑی وجہ یہ ہی کہ اُن کی قوم دولت مند ہی جو ان کی خدمت کرتی ہی۔ پنجاب کے اضلاع کے بندوبست کی رپوٹیں میرے سامنے نہیں ہیں۔ البتہ میں ضلع سہارن پور کے متعلق جو پنجاب سے متصل ہی یہ عرض کرسکتا ہوں کہ گزشتہ بندوبست کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ گزشتہ تیس ۳۰ سال میں ہنود فقرا جوگیوں اور گوشائیوں کی جائدادیں بقدر سترہ فی صدی کے بڑھ گئیں مگر سادات کی جائدادیں بقدر گیارہ فیصدی کے گھٹ گئیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہی کہ دیگر اقوام میں خیرات لینے والی ذاتیں بھی دولت اور جائداد میں ترقی کر رہی ہیں۔ برخلاف اس کے مسلمانوں میں اعلیٰ ذاتیں بھی اپنا ہر ہر قدم افلاس کی طرف بڑھا رہی ہیں۔

۱۶۔ نو مسلم گداگر سب سے آخر میں وہ اعداد پیش کرنا چاہتا ہوں جنھیں سُن کر تمام مسلمانوں کو اور خاص کر اُن بزرگوں کو جو مذہبی اشاعت و تبلیغ کا کام کرتے ہیں سخت حیرت ہوگی۔ اس کی تفصیل یہ ہی کہ اس صوبہ میں بعض ایسی ذاتیں ہیں جن کا ایک حصہ عرصہ دراز سے مسلمان ہی باقی ماندہ بدستور ہندو اور سکھ چلا آتا ہی۔ مثلاً جاٹ ہندو ہیں

سکھ ہیں اور سینتالیس فی صدی مسلمان ہیں۔ مردم شماری کے اس خانہ میں جس میں گداگروں۔ آوارہ گردوں اور کسبیوں کی تعداد دکھائی گئی ہے۔ جاٹ مسلمان مردوں کی تعداد اٹھارہ ہزار اور عورتوں کی پندرہ ہزار درج ہے اور ہندو اور سکھ جاٹوں میں یہ خانہ خالی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کی تعداد مردوں میں ایک ہزار سے اور عورتوں میں ایک سو سے کم ہے ذیل میں ان تمام ذاتوں کی تعداد مع تفصیلات کے درج کیجاتی ہے

نام ذات	مردم شماری	مرد	عورت
جاٹ مسلمان	۴۷ فی صدی	۱۸,۰۰۰	۱۵۰۰
جھینور مسلمان	۲۵ ″	۹,۰۰۰	۴۶۰۰
جولاہہ مسلمان	۹۰ ″	۱۳,۰۰۰	۳۲۰۰
کمبوہ مسلمان	۴۰ ″	۱۱,۰۰۰	۱۶۰۰
کمہار مسلمان	۶۷ ″	۱۲,۰۰۰	۲۵۰۰

بے شک بعض نومسلم ذاتیں مثل راجپوتوں، گوجروں، لوہاروں اور نائیوں کے ایسی بھی ہیں جو ان ذاتوں کے ہندوؤں کی طرح ان شرمناک موں میں نہیں ہیں۔ تاہم مندرجہ بالا پانچ ذاتوں سے متعلق مسلمانوں کو غور کرنا پڑیگا کہ وہ کیا وجوہ ہیں جن سے ایک ہی ذات کے لوگ جو مسلمان ہیں وہ کثرت کے ساتھ آوارہ گرد۔ گداگر وغیرہ ہیں اور جو غیر مسلم ہیں ان کی تعداد ان شرمناک پیشوں میں بمنزلہ نفی کے ہے جن بزرگوں نے ان ذاتوں اور قوموں میں تبلیغ کا کام کیا ہے۔ وہ اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔

میں پار سال ضلع میرٹھ میں جاٹ مسلمانوں کے ایک جلسہ میں گیا تھا جس میں کئی ہزار مسلمان جمع تھے اس موقع پر ایک مولوی صاحب موجود تھے جنھوں نے رقبۂ ارتداد میں عرصہ تک کام کیا تھا۔ فرمانے لگے کہ ان لوگوں کو اسلام پر قایم رکھنے کے لیئے فضائل اسلام سنانے کے مقابلہ میں ذرائع معاش بتانا اور انھیں سرمایہ داروں کی غلامی سے نکالنا بدرجہا زیادہ مفید ہوگا۔

ممکن ہی کہ تحقیق و تفتیش سے ان ذاتوں کے مسلمانوں کے اخلاقی تنزّل کے کوئی اور وجوہ معلوم ہوں مگر سرسری نظر سے تو یہی معلوم ہوتا ہی کہ افلاس نے اُن کے تمام اخلاقی محاسن کو فنا کر دیا ہی اور وہ اپنی شکم پری کی خاطر ایسے ناپاک اور حیا سوز مشاغل اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جو مسلمانوں کے لیئے باعث شرم و ندامت ہیں۔ بہرحال ہماری کم مائگی اور اخلاقی تہی دستی اور عام انحطاط کی جب یہ حالت ہی تو دیگر اقوام کے لیئے وہ کونسی وجہ ترغیب ہی جو اُن کو ہماری طرف مائل کرسکے اور ہمیں کیا حق ہی کہ کھاتے پیتے لوگوں کو مسلمان کرکے انھیں اپنی طرح مفلس و قلّاش بنائیں۔

۱۷۔ اقتصادی کمزوری کا علاج

بڑا افسوس یہ ہی کہ مسلمان بعض ظاہری باتوں سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کی حالت بہتر ہو رہی ہی۔ دس بیس سال کے عرصہ میں اگر وہ تعلیم میں یا چند ملازمتوں میں اپنی تعداد میں کچھ اضافہ دیکھتے ہیں تو اس سے

خوش ہو کر حساب لگاتے ہیں کہ اتنے عرصہ میں وہ دیگر اقوام کو پکڑ لیں گے
مگر میں کہتا ہوں کہ اقتصادی حالت کی کمزوری کی وجہ سے کسی قوم
کا پکڑ لینا تو درکنار مسلمان بہ حیثیت قوم کے خود زندہ نہیں رہ سکتے۔ اور زندہ
نہ رہنے کے یہی معنی ہیں کہ وہ طبقہ اسفل میں اترتے چلے جائیں جیسا کہ غیر
محسوس طریقہ سے اتر رہے ہیں۔ میں نے اسی حالت کو ایک موقع پر ان
الفاظ میں عرض کیا تھا کہ "مسلمانوں کی تعلیم صنعت و حرفت، زمینداری
اور کاروباری ترقی کی ٹرین کا انجن اس وقت پانی اور کوئلہ کا سرمایہ کم ہو جانے
سے دھیما ہوتا جاتا ہے اور قریب ہے کہ وہ رک کر کھڑا ہو جائے اور سب
طرف سے ڈاکو جمع ہو کر اس ٹرین کے مسافروں کو لوٹ لیں اور اس کا
خاتمہ کر دیں۔ نہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی ٹرین کچھ عرصہ سے
رک کر کھڑی ہو چکی ہے اور اس کی بعض گاڑیاں لٹ رہی ہیں اور لٹنا
یہ ہے کہ غربا کے طبقہ میں ہمارے بھائی کچھ تو علانیہ اور کچھ خاموشی کے
ساتھ جن کا ہمیں پتہ نہیں اشدھی کیے جا رہے ہیں انھیں بچانے کے
لیے تبلیغی جماعتیں دوڑ پڑیں اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا انھوں
نے کیا۔ مگر اب سرمایہ ختم ہو جانے کی وجہ سے پسپا ہو رہی ہیں اور
غریب مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑنے پر مجبور ہیں۔

۱۸۔ افلاس کا علاج

جس درجہ پہ مسلمانوں کی اقتصادی کمزوری
پہنچ چکی ہے اور جو اس کے خراب نتائج عنقریب
پیدا ہونے والے ہیں۔ اس کا پورا اندازہ تو مسلمانوں کو ہی نہیں البتہ

انھیں عام مالی انحطاط کا احساس نتیجۃً کچھ ضرور ہی۔ اس لیئے مختلف علاج
پیش کیئے جاتے ہیں کبھی خیال ہوتا ہی کہ مسلمانوں کو اپنی مسرفانہ رسوم
میں اصلاح کرنی چاہیئے کبھی کفایت شعاری کا ارادہ کیا جاتا ہی۔ کبھی
صنعت و حرفت کے اسکول قائم کیئے جاتے ہیں کبھی خاص مسلمانوں
کی دُکانیں کھولی جاتی ہیں اور عہد کیا جاتا ہی کہ غیر مسلموں کی دوکانوں سے
کبھی سودا نہ خریدیں گے۔ حالانکہ عام دوکانوں کے اجزا زیادہ تر غیر مسلموں
ہی سے سود پر لیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمان تاجروں کی جان
غیر مسلم سرمایہ داروں کی مٹھی میں رہتی ہی جب وہ ذرا اپنی مٹھی دبا دیتے ہیں
تو مشرق سے غرب تک اور جنوب سے شمال تک مسلمان تاجروں کے دوالے
نکلنے اور اُن کے کاروبار بگڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ کفایت شعاری
کرنے اور دکانیں وغیرہ کھولنے کی جو تدابیر پیش کی جاتی ہیں ایک حد تک
مفید ضرور ہیں مگر چونکہ وہ محض سطحی علاج ہیں اس لیے کچھ ہوتا ہوا تا نہیں اور
ہر کوشش کے بعد حالت پہلے سے بدتر ہو جاتی ہی۔ میرے نزدیک مسلمانوں
کی اقتصادی کمزوری کا جو علاج ہی اُسے اس وقت پیش کرنے کا نہ وقت ہی اور
نہ موقع البتہ بزرگان قوم کی اگر کوئی کمیٹی اس مسئلہ کی تحقیقات کے لیئے مقرر کی
جائے تو میں اس کے سامنے اپنی تجاویز پیش کرنے کو تیار رہوں۔
آخر میں عرض ہی کہ قوم کی واقعی حالت جو آپ کے سامنے پیش کی گئی
ہی اس سے آپ کو ضرور تکلیف ہوئی ہو گی مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ
جو کچھ میں نے عرض کیا وہ کسی خوشی سے نہیں بلکہ نہایت دلی تکلیف اور

حد درجہ کی مجبوری سے عرض کیا ہے۔ بے شک بعض امراض کی توضیح کرنے میں تفضیح کا اندیشہ ہوتا ہے مگر مرض کا چھپانا بدتر بلکہ اور زیادہ مضر ہوتا ہے۔ اس لیئے میں نے اس کا ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔

اُمید کہ آپ میری کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کو نظر انداز فرماویں گے

۱۹۔ عملی تجاویز

مندرجہ بالا مضمون انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھا گیا۔ جسے سُن کر حاضرین نے طے کیا کہ اُسے زیادہ تعداد میں چھاپ کر تقسیم کیا جائے اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سلسلہ میں کچھ عملی تجاویز پیش کروں۔ میرے نزدیک افلاس کے سیلاب نے ہر طرف سے مسلمانوں کو اس طرح گھیرا ہے کہ اُن کی کوئی جماعت اس سے محفوظ نہیں۔ ہماری قوم کے امیر و غریب دین دار اور دُنیا دار، علما اور درویش، کوآپریٹر اور نان کوآپریٹر سب کے سب یکساں خطرے میں ہیں اور کم و بیش اس خطرے کو محسوس کر کے جو جس سے بن پڑتا ہے کر رہا ہے کوئی اشاعت تعلیم کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا صنعت و حرفت اور تجارت کی ترویج کی۔ کوئی مختلف قوموں میں باہمی اتحاد و اتفاق کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا تبلیغ و اشاعت مذہب کی، مگر باوجود ہر قسم کی امکانی تدابیر کے قوم کی کشتی بہ ہی طور پر پانی میں اتری چلی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو تدابیر اختیار کی جارہی ہیں وہ بہ اعتبار نتیجہ کے دیر طلب ہیں۔ اس لیئے ان تدابیر کو بدستور جاری رکھنے کے ساتھ اس امر کی صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ عین وقت ہے کہ ایک جماعت خالص مالی مسئلہ کو فوراً اپنے ہاتھ میں لے کر

قومی کشتی کو ڈوبنے سے بچائے۔ اس کے لیئے صدر مقام لاہور میں ایک مرکزی جماعت قایم کرنی پڑے گی مگر اس کے قیام کے انتظار میں افراد کو اپنا کام ملتوی نہ کرنا چاہیئے بلکہ ہر مقام کے مسلمان اپنے ضلع یا شہر، قصبہ یا گاؤں بلکہ محلہ میں ایک انجمن "فلاح المسلمین" کے نام سے یا کسی اور نام سے قایم کریں اور اس میں مثلاً ذیل کے طریقے اختیار کریں۔

(۱) سرکاری رپورٹوں اور ذاتی تحقیقات سے مقامی مسلمانوں کے اقتصادی، صنعتی اور تجارتی حالات مرتب کریں۔

(۲) مقامی حالات کے اعتبار سے وہ طریقے تجویز کریں جن سے جملہ شعبہ جات زندگی میں مسلمانوں کی مالی حالت درست ہو۔ اس قسم کے طریقوں کے متعلق میں نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ ضرورت ہو تو محصول ڈاک کے لیئے آدھ آنہ کا ٹکٹ بھیج کر مجھ سے منگالیں۔ رسالہ کا نام مسلمانوں کی مالی اصلاح ہے۔

(۳) مسلمانوں کو کفایت شعاری سکھانے کے لیئے مثلاً اس قسم کے طریقے جو مشورے سے طے ہوں اختیار کریں۔

(الف) قرضداری اور سود دینے کے خراب نتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا اور جو لوگ مقروض ہیں اُن سے مل کر انھیں مناسب مشورے دینا۔

(ب) عام طور پر تقریروں کے ذریعہ سے لوگوں کو حساب لگا کر بتانا کہ مثلاً ایک سو روپیہ کا سودی قرضہ دس سال میں بڑھ کر کتنا ہو جاتا ہے مسلمانوں کو بالعموم معلوم نہیں ہوتا کہ سال و رسود در سود، اور شش ماہی

سہ ماہی اور ماہوار سود در سود میں کوئی زیادہ فرق ہی۔ اس لیئے دستاویزیں لکھتے وقت وہ ان جزئیات کی کچھ پروا نہیں کرتے ہیں حساب لگا کر انھیں ان کا فرق بتانا تاکہ قرض لیتے وہ ان امور کا خیال رکھیں۔

(ج) قرضہ سے جو مسلمان برباد ہوتے ہیں اُن کے حالات سے واقف رہنا اور دوسرے مسلمانوں کو اُن سے آگاہ کرنا تاکہ انھیں عبرت ہو اور وہ قرضداری سے بچیں۔

(د) مختلف برادریوں میں یہ قانون پاس کرانا کہ جو شخص مقروض ہو اس کی کسی دعوت یا تقریب میں اس کا کھانا قبول نہ کیا جائے جب تک کہ وہ قرضہ سے سبکدوش نہ ہو۔

(ہ) گھروں میں اور اسکولوں میں بچوں کو کفایت شعاری کی تعلیم دینا۔

(و) مسلمانوں کو ایسے طریقے بتانا جن سے وہ افراد کاسب نہیں اور ان کی مالی حالت درست ہو۔

(ز) اور سب سے آخر مگر سب سے اہم اور ضروری یہ امر ہے کہ مسلمانوں میں روپیہ کا کاروبار اور داد وستد عام طور پر جاری کرانے کی کوشش کرنا، انجمن ہائے امداد باہمی اور بینک قائم کرنا۔

(۴۳)

بار برداری کے اونٹ اور مسلمان

میں ایک روز سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ ایک میدان میں میں نے بہت سے اونٹ دیکھے۔ اونٹوں کے پاس بڑے بڑے لکڑی کے صندوق، غلہ کے بورے اور چھوٹے بڑے خیمے اور مختلف قسم کی چیزیں پھیلی پڑی تھیں۔ کچھ اونٹ تو لدلدا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کچھ لدتے اور بلبلاتے جاتے تھے۔ کچھ اپنا بوجھ دیکھ کر شور کر رہے تھے اور کچھ زمین پر چاروں ٹانگیں پھیلائے پڑے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنے والی مصیبت سے کس قدر خائف ہیں۔

ان اونٹوں کی بے بسی دیکھ کر اور ملک عرب سے اونٹوں کی مناسبت خیال کر کے بے اختیار مسلمانوں کی محنت و مشقت اور ان کی مفلسانہ زندگی کا سماں میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جس طرح اونٹ زیادہ سے زیادہ بوجھ اُٹھا کر اور اس کے بدلے میں محض درختوں کے پتے اور سوکھی جھاڑیاں کھا کر خوش حال بیوپاریوں اور تاجروں کی دولت میں اضافہ کرتے ہیں اسی طرح مسلمان بھی سخت سے سخت مشقت اور غربت کی زندگی بسر کر کے سرمایہ داروں کے گھروں کو دولت سے مالا مال کرتے ہیں۔

یہ کس طرح ہوتا ہے؟ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک جولاہہ کسی مہاجن سے سوت اُدھار لاتا ہے جو بازار کے عام نرخ سے گراں ہوتا ہے۔ تمام دن خود

اور بیوی بچوں کو لگا کر جو کپڑا تیار کرتا ہے وہ اپنے قرض خواہ کے پاس لے جاتا
ہے جو اس تھان کو رکھ کر جو دام چاہے لگاتا ہے اور جولاہے کو کھانے کے
لیے کچھ دام دے کر رخصت کر دیتا ہے جس طرح جولاہا مدت العمر اپنے
مہاجن کے شکنجے میں پھنسا رہتا ہے۔ اسی طرح تمام مسلمان کاریگر خواہ
کشمیر میں شال دوشالے بناتے ہوں یا ڈھاکہ میں باریک ململ بنتے ہوں
دہلی میں زردوزی کا کام کرتے ہوں یا بنارس میں ریشمین کپڑے تیار کرتے
ہوں، سرمایہ داروں کے غلام ہیں اور انھیں اونٹوں کی مانند ہیں جو
تاجروں کے مال کی باربرداری کر کے ان کی دولت و ثروت بڑھاتے
ہیں اور خود نیم کے کڑوے پتوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ کوئٹہ میں جہاں
انگور، سردہ اور لذیذ ترین میوہ جات پیدا ہوتے ہیں۔ وہاں سے لاکھوں
من میوہ ہزاروں من برف میں محفوظ ہو کر پارسل ٹرینوں میں ریگستان
کی گرد اور گرمی کو بے کھٹکے طے کرتا ہوا تمام بڑے شہروں میں ملک کے دوسرے
کنارے تک اس کثرت سے پہونچتا ہے کہ سبزی منڈیوں میں ہر طرف انگور
اور میوہ ہی میوہ نظر آتا ہے۔ مگر حیرت انگیز امر یہ ہے کہ خود کوئٹہ کے غریب
مسلمانوں کو میوہ جات کی پارسلیں ڈھونے میں اتنا ہی ملتا ہے کہ وہ روکھی
سوکھی روٹی اور سڑے گلے پھلوں سے شکم پوری کر لیں اور اتنا نہیں ملتا
کہ اپنے ملک کے تر و تازہ میوہ جات سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

نہ صرف مسلمان مزدوروں اور کاریگروں اور کسانوں کا یہ حال ہے
بلکہ بڑے بڑے زمیندار اور تاجر اپنی کمائی کا بڑا حصہ سرمایہ داروں کو

تذکرہ کرنے پر مجبور ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی تمام قوم مثل بار برداری کے اونٹوں کے سخت تریں زندگی بسر کر رہی ہی۔ اس حالت سے نکلنے کا علاج بجز اس کے نہیں ہی کہ مسلمان روپیہ کا کاروبار کریں، انجمن ہائے امداد باہمی اور بینک قایم کریں اور روپیہ کا بچانا اور بڑھانا سیکھیں۔

دسمبر ۱۹۲۵ء

سنہ ۱۹۲۶ء

(۲۴)

سودمند کا ماضی اور مستقبل

۱۔ سودمند کے تین دور سودمند کو جاری ہوئے اگرچہ صرف چھ ماہ گزرے ہیں مگر مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح کے سلسلہ میں تبلیغ و اشاعت کا کام سنہ ۱۹۲۰ء سے جاری ہی جس کو چھ سال کا زمانہ ہوچکا ہی۔ اس تحریک کا پہلا دور کتابوں کی اشاعت سے ہوا جن میں سب سے پہلی کتاب "مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل" تھی جو علمائے کرام، رہبران قوم اور اڈیٹران اخبارات کی خدمت میں بھیجی گئی۔ اس کے دو سال بعد "سرمایہ داروں کی غلامی اور مسلمان" اور اس کے بعد "جواز سود" اور "مسلمانوں کی مالی اصلاح" دس ہزار سے زیادہ تعداد میں ملک میں تقسیم ہوئیں۔ دوسرا دور اخبارات میں مضامین

کی اشاعت کا تھا جس میں مسئلہ سود پر اختلافی مضامین کا اور قلمی مباحثوں کا خوب چرچا رہا۔ اور تیسرے دور کو علمی دور کہنا بجا ہوگا جب کہ یکم جون ۱۹۲۵ء سے سود مند جاری ہوا اور اس کے اثر سے بعض مقامات میں مسلمانوں میں روپیہ کا کاروبار جاری ہونا شروع ہوا۔

۲۔ سود سے مسلمانوں کی بربادی اس تحریک کے شروع میں سب سے بڑی مشکل پیش آئی کہ مسلمانوں کے نزدیک "سود" کا لفظ ربوا کا مرادف سمجھا جاتا تھا اور ایسا ہی مکروہ تھا جیسا کہ دنیا کی جملہ دیگر اقوام کے نزدیک کسی زمانہ میں رہ چکا تھا دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی قوم ایسی نہ تھی جس میں مثل مسلمانوں کے سود حد درجہ ممنوع اور معیوب نہ سمجھا جاتا ہو۔ کیوں کہ اس زمانہ میں روپیہ بالعموم ذاتی ضروریات کے لیئے قرض لیا جاتا اور غیر نفع آور کاموں میں صرف ہو کر قرض لینے والوں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوتا تھا مگر امتداد زمانہ سے روپیہ کثرت کے ساتھ نفع آور کاموں میں لگ گیا دائن اور مدیون دونوں کے لیئے سراسر مفید ثابت ہونے لگا اور اس سراسر فائدہ کو دیکھ کر دیگر اقوام و مذاہب نے تجارتی سود کو ربوا سے ممیز کر کے اس کا نام انٹرسٹ رکھا اور اس کو قانوناً اور مذہباً جائز قرار دے دیا۔

زمانہ سابق میں ہر طرف مسلمانوں کی سلطنتیں عروج پر تھیں اور ان کا دارو مدار تجارت اور سود پر نہ تھا اس لیئے انھیں اس مسئلہ کے حل کرنے کی طرف توجہ نہ ہوئی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ مسئلہ لاینحل رہا اور آج نے

بالآخر مسلمانوں کو برباد کر کے چھوڑا اور نہ صرف اُن کی زمینداریاں بلکہ سلطنتیں تک سب اسی سود مردود کے نذر ہوگئیں۔

ہندوستان کی اسلامی سلطنت کی بربادی کے بعد بعض علمائے کرام کو مثل حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے اس مسئلہ کی طرف توجہ ہوئی اور اُنھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر کچھ فتوے سود کے جواز میں دیئے مگر چوں کہ وہ قوم کے انحطاط کا وقت تھا اس لیے افراد قوم نے عام طور پر اُن فتووں پر عمل درآمد نہیں کیا جس نے مسلمانوں کی رہی سہی زمینداریوں اور تجارت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ مگر دوسری قوموں کی ترقی کی غیر معمولی رفتار اور اپنے انتہائی تنزل کو محسوس کر کے مسلمانوں میں کچھ عرصہ سے ایک حرکت پیدا ہوئی جس کو حرکت مذبوحی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ کیوں کہ بلا لحاظ اس اندازہ کے کہ مقصود کیا ہے ذبیحہ نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ چنانچہ گذشتہ پچاس سال سے کوئی تدبیر اور کوئی نسخہ ایسا نہیں جس کا مسلمانوں نے تجربہ نہ کر لیا ہو تعلیم، سیاسیات، پین اسلامزم، اسلامی ممالک کی طرف رجوع، صنعت و حرفت کا چرچا، اپنی دوکانیں کھولنے کا ولولہ۔ برادران وطن اور سلطنت سے کبھی محبت و اتحاد اور کبھی نفرت و بیزاری۔ غرضکہ سب کچھ کر لیا اور سب کچھ کر رہے ہیں۔ مگر با ایں ہمہ ہر شخص کو بدیہی طور پر محسوس ہو رہا ہے کہ ہم گر رہے ہیں، پس رہے ہیں، مٹ رہے ہیں، دوسروں میں جذب ہو رہے ہیں اور ختم ہو رہے ہیں۔

۳۔ سود مند کا کام

"سود مند" نے آکر با آواز بلند کہا کہ ہماری ناکامی کی تہہ میں وہی سود کا مسئلہ ہے جسے دیگر اقوام و مذاہب صدیوں پہلے طے کر چکے اور ربوا کو جو کہ ہر ملاہل تھا "انٹرسٹ" یا تجارتی سود میں منتقل کر کے اسے "امرت" بنا چکے۔

خدا کا شکر ہے کہ "سود مند" کی اس صدا پر بجائے لبیک کی صدائیں آئیں۔ ہر طرف سے ہزاروں کی تعداد میں مبارکباد اور حوصلہ افزائی کے خطوط آنے لگے۔ قومی اخبارات نے عمدہ تنقیدیں کیں، اس کے مضامین اور نظموں کو اپنے قیمتی کالموں میں جگہ دی۔ سب نظمیں اگرچہ شاعری کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کی نہ تھیں تاہم چوں کہ مسلمانوں کے درد دل کا مرقع تھیں اس لئے دل ہی پر جا کر لگیں اور خوب مقبول ہوئیں۔ بعض علمائے کرام نے حدود شرعیہ کے اندر سود کی تلقین کی، بینک سے سود وصول کرنے کی تاکید کی اور اسے اپنے مصرف میں لانے اور نیک کاموں میں صرف کرنے کے جواز کے فتوے دیئے۔ چنانچہ جناب مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب صدر جمعیتہ العلماء ہند نے تحریر فرمایا کہ:۔

> "سیونگ بینک کے سود میں مضائقہ نہیں۔ اگر احتیاط اور تقویٰ منظور ہو تو کسی دوسرے مفلس مسلمان پر خرچ کر دیجئے لیکن گورنمنٹ کے پاس کسی حالت میں چھوڑنا بہتر نہیں"

اس فتوے سے امید ہے کہ تمام اسکولوں اور مدرسوں ... کا روپیہ جو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں [illegible] پڑا ہے۔ سیونگ بینکوں میں داخل ہو گا

زیادہ محفوظ ہو جانے کے ساتھ مستقل آمدنی کا ذریعہ ہوگا اور مدارس کے لیئے روز روز کا سہ گدائی گشت کرانا نہ پڑے گا۔

غرض کہ خدا کے فضل سے اب ایک حد تک مسلمان بیوپار اور تجارتی سود میں فرق سمجھنے لگے ہیں اور روپیہ کے کاروبار کو اپنے اپنے دائرہ اثر میں رائج کرنے کی عملی تدابیر اختیار کر رہے ہیں جس کا اندازہ "سود مند" کے صفحات کے مطالعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ایڈیٹر سود مند نے یہ سمجھ کر کہ وہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ "(تم ایسی باتیں کیوں کہتے ہو جن کو کرتے نہیں)" کے مصداق نہ بنے، خود زمینداروں کے بینک قائم کرنے کے لیئے ضلع میرٹھ کے سولہ دیہاتوں میں دورہ کر کے ۳۴۲ حصہ دار پیدا کیئے اور ارادہ ہے کہ مسلم زمینداروں کے بینک کی جلد سے جلد رجسٹری کرادی جائے۔

۴۔ سود مند کا مستقبل یہ سب تو سود مند کا ماضی ہے۔ رہا مستقبل اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ دو سال کام کرنے کا جو ارادہ ظاہر کیا گیا تھا اس میں نصف سال گزر چکا اور صرف ڈیڑھ سال باقی ہے۔ آج کل مسلمانوں پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ان کا انجام یہاں بھی اسپین کی طرح ہونے والا ہے۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ اس وقت تمام مسلمانوں کی کمزوری کی تہ میں ان کی مالی حالت کی خرابی ہے۔ زمیندار، تاجر اور کاریگر سب کے سب دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام اور ہر طرح زیر بار اور کمزور ہیں۔ چنانچہ جس قدر بلوے ہوتے ہیں ان میں مار پیٹ کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو مگر اقتصادی کمزوری کی وجہ سے چونکہ قانونی پیروی پوری طرح نہیں ہو سکتی اس لیئے

بالعموم مسلمان ہی سزا پاتے ہیں اور آئندہ کے لیئے پست ہمت ہوجاتے ہیں اور اب تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہو کہ مثلاً اٹاوہ کے مسلمان اپنی مساجد میں قفل لگا کر چلے جاتے ہیں تب بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوٹتا اٹاوہ میں مسجد کے سامنے بھنگیوں نے گانا بجانا کرکے اودھم مچائی اور مسلمان کچھ نہ کرسکے اسی طرح اس وقت مارہرہ میں چماروں نے بستی کے شرفا پر عدالت میں دعوے دائر کرکے اُن کو پریشان کر رکھا ہو۔

پس اگر درحقیقت مسلمانوں کو زندہ رہنا اور عزت کی زندگی بسر کرنا ہو تو اُن کے ہر ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ روپیہ بچانے اور بڑھانے کے طریقے اختیار کرکے اپنے بچوں، خاندان، اور قوم کو تباہی سے بچائے اور مسلمان کانفرنس اور اور سرکاری گروں کو معین منافع پر روپیہ دے کر ان کے کاروبار کو چلتا کرے۔ امداد باہمی کے بینک قایم کرے۔ یہی ان کی نجات کا واحد ذریعہ ہو اور اس کی تبلیغ و تعمیل کے لیئے ڈیڑھ سال کا وقت کچھ کم نہیں ہو بشرطیکہ قوم اس طرف متوجہ ہو۔

اسی سلسلہ میں قومی اخبارات کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہو جنھوں نے اس مسئلہ کی تبلیغ میں بہت مدد کی۔ اس وقت ''سود مند'' کے نسخے چھپے اسلامی اخبارات کے دفاتر میں بھیجے جاتے ہیں حالانکہ تبادلہ میں ایک درجن سے زیادہ اخبارات نہیں آتے۔ غرض صرف یہ ہو کہ ہمارے خیالات سے انھیں واقفیت ہو اور قوم کی اصلی ضرورت کی طرف انھیں توجہ ہو اور ڈیڑھ سال کے عرصہ میں وہ خود اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہمیں

اس خدمت سے سبکدوش کر دیں۔ جنوری ۱۹۲۶ء

---

(۲۶)

ایک پیر مرد خواب میں

مفتی جی کی خاندانی حالت

قصبہ عثمانپور ہنڈن ندی کے کنارے ایک پرانی بستی ہے۔ مفتی عظیم الدین اس کے سب سے بڑے زمیندار ہیں قصبہ کی زمینداری کے علاوہ ان کے متعدد مواضعات کئی ہیں جن میں سے تین تو بڑے زبردست تخت گاؤں ہیں۔ مفتی صاحب کا رویہ ایسا ہے کہ نہ انہیں کوئی مسرف کہہ سکتا ہے نہ بخیل۔ میانہ روی جو آدمیوں کا طریقہ ہوتا ہے وہی اُن کا شعار ہے۔ اُن کی ریاست کا اور گھر کا حساب باقاعدہ لکھا جاتا ہے اور حتی الامکان ہر امر میں کفایت شعاری برتی جاتی ہے تاہم مفتی صاحب کے والد ماجد کے وقت سے ریاست پر جو قرضہ چلا آتا ہے اُس میں ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی سال فصل کے وقت سرکاری مالگذاری کی ادائیگی اور کچھ روزمرہ کے اخراجات کے لیے رکھ لینے کے بعد کل روپیہ قرضہ میں ادا کر دیا گیا تاہم سال کے آخر میں اتفاقی ضرورتوں کی وجہ سے کچھ نہ کچھ روپیہ قرض لینا پڑا اور انجام کار انہیں بھی قرضہ میں شامل کر لیا گیا۔

مفتی صاحب خود اپنی ذات سے [illegible] درجہ کی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں

اور اپنے متعلقین کو بھی سادہ زندگی کی تاکید کرتے رہتے ہیں اور بظاہر گھر میں کوئی بیجا خرچ نظر نہیں آتا اور زمینداری کی وجہ سے ایندھن کے لیئے لکڑی مویشیوں کے لیئے چارہ اور بہت سی دوسری چیزیں گاؤں سے مفت آجاتی ہیں تاہم زمینداری کے روپیہ میں کچھ ایسی بے برکتی ہے کہ ادھر آیا ادھر خرچ ہو گیا۔ مفتی صاحب ہر چند سال کے اخراجات کا تخمینہ کر کے چند مہینے کا خرچ رکھ لیتے ہیں مگر کوئی مقدمہ آلگا یا غیر معمولی چندے دینے پڑے، کوئی تقریب پیش آگئی تو بس پھر تمام بجٹ درہم برہم ہو جاتا ہے اور پھر قرض لیئے بغیر چارہ نہیں ہوتا یہی حال گھر میں رہتا ہے کہ فصل پر غلہ اور ہر قسم کی جنس رکھ لی گئی ہے تب بھی غیر معمولی مہمانداری یا ناگہانی حادثات کی وجہ سے بیوی صاحبہ کو مفتی جی سے چھپا کر زیور پر روپیہ منگانا پڑتا ہے جو انجام کار اکثر تلف ہو کر رہتا ہے غرض کہ تمام خاندان اسی چکر میں ہے اور کوئی علاج بن نہیں پڑتا۔

البتہ مفتی صاحب نے اس کشمکش میں ایک بڑا کام یہ کر لیا کہ اپنے لڑکوں کو جس طرح بن پڑا جائداد بیچ کر تعلیم کے زیور سے آراستہ کر دیا سب سے بڑے بیٹے کریم الدین مفتی ایم اے ان کی زندگی میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے منجھلے بیٹے علیم الدین مفتی بی اے ابھی امیدوار نائب تحصیلدار تھے کہ مفتی عظیم الدین کا انتقال ہو گیا۔ اس لیئے سب سے چھوٹے بیٹے محی الدین کی تعلیم نا تمام رہ گئی اور چوں کہ بڑے مفتی صاحب کے انتقال کی وجہ سے گھر پر کسی ایک بھائی کا رہنا ضروری تھا اس لیئے محی الدین اپنے باپ کی گدی پر بیٹھے۔ اعلےٰ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے چوں کہ انھیں مثل بڑے بھائیوں کے مفتی صاحب کا لقب اپنے نام کے بعد

لگانے کا موقع نہ تھا اس لیئے پُرانے طریقہ کے مطابق اُن کا نام مفتی محی الدین رہا۔

۴۔ مالی حالت

مفتی محی الدین پر اس نوعمری اور ناتجربہ کاری میں تمام خاندان کا اور بالخصوص قرضہ کا بار آپڑا اوّل چند سال تک تو اُنھوں نے اخراجات گھٹانے اور آمدنی بڑھانے کی جان توڑ کوششیں کیں یہ سمجھ کر کہ زمینداری کے اثر سے بھٹے کا اکثر سامان مفت مل سکے گا اُنھوں نے اینٹوں اور چونے کے بھٹے لگا دیئے فصل پر غلہ بھرا اور چند کاروبار جاری کیے مگر جو کام بھی وہ کرتے تھے اور جو کچھ بھی وہ پیدا کرتے تھے اُس میں سے چونکہ ایک روپیہ سیکڑہ سود مہاجن کے نذر کرنا پڑتا تھا اس لیئے سال تمام پہ جب حساب ہوتا تو معلوم ہوتا کہ آمد و خرچ برابر ہے۔ قرضہ بدستور موجود ہے اور محض اُن کی عرق ریزی، جانکاہی اور دلسوزی [illegible] میں ہے۔ اس قدر کفایت شعاری، ذاتی نگرانی اور محنت کے بعد اگر دو چار سو روپیہ بھی پس انداز ہوجاتے تو اُن کی عرق ریزی اور مشقت کی کچھ تو تلافی ہوجاتی کیونکہ جسمانی محنت کا جب کچھ پھل مل جاتا ہے تو وہ انسانی صحت میں ممد ہوتا ہے لیکن اگر کچھ نہیں ملتا تو وہی محنت دل بٹھا کر انجام کار ہلاکت کے درجہ پہ پہونچا دیتی ہے۔ مفتی محی الدین جب پریشان ہوتے تو اپنے بڑے بھائیوں کریم الدین ڈپٹی کلکٹر اور علیم الدین کو جو اب تحصیلدار ہوگئے تھے خط لکھتے کہ وہی ادائی قرضہ میں کچھ مدد دیں مگر جدید طریقہ بود و باند نے عہدہ داروں کے اخراجات اس قدر بڑھا دیئے ہیں کہ خود اُن کی بسر اوقات بمشکل ہوتی ہے۔ پچھلے زمانہ میں سب جج اور ڈپٹی کلکٹر شہروں کی گنجان آبادیوں میں رہتے تھے اور اگر دیانت دار رہتے

لہ مزید برآں

تب بھی تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے جائداد خرید لیتے تھے جو ہنی ماشہ میں بڑھ کر تعلقے ہو گئے ہیں۔ اس زمانہ کی یورپین معاشرت میں بڑی بڑی تنخواہوں میں بھی بلیتیں نکلا جاتا ہے کوٹھیوں بنگلوں میں رہنے سے عزت آبرو سنبھالنی مشکل ہو جاتی ہے اور بڑی کامیابی اس میں سمجھی جاتی ہے کہ مدت العمر کی ملازمت میں رہنے کو ایک عمدہ مکان بنا لیا اور پنشن کے وقت چند ہزار روپیہ پراویڈنٹ فنڈ سے مل گئے اور بس۔ بہرحال کریم الدین اور علیم الدین باوجود کوشش کے خاندانی قرضہ کی ادائیگی میں کچھ مدد نہ کر سکتے تھے اور افکار کا بار تمام تر منشی محی الدین کے کندھوں پر پڑا تھا۔ وہ شب و روز قرضہ کی ادائیگی کی تدبیریں سوچا کرتے اور گھنٹوں غوطہ میں رہتے۔ کبھی کبھی اُن کے دل میں یہ خیال گذرتا کہ سود کا علاج بالمثل کیا جائے تو شاید اس موذی کے چنگل سے رہائی ہو مگر ہوش میں آتے تو اس وسوسۂ شیطانی سے توبہ کرتے۔ پھر دوسرے وقت افکار کا ہجوم ہوتا تو مسئلہ سود پر غور کرتے اور جو مضامین اخبارات میں اس مسئلہ کے متعلق شایع ہوتے رہتے ہیں اُن سے اثر پذیر ہوتے۔ بالآخر انھوں نے رسالہ جات جواز سود مع فتاویٰ اور ماہواری رسالہ "سود منہ" جو علی گڑھ سے نکلتا ہے منگا کر پڑھے اس نے اُن کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں معلوم ہوا کہ بالخصوص زمینداری کے پیشہ میں انھیں لوگوں کی جائدادیں محفوظ رہتی ہیں جو غلہ یا روپیہ کا کاروبار کرتے ہیں یہ کتابیں پڑھ کر منشی صاحب کے نزدیک یہ مسئلہ بالکل صاف ہو گیا مگر مولوی صاحب اور منشی صاحب کہلا کر اُن کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ علانیہ روپیہ کا کاروبار شروع کر کے خاندان کے

نام کو بٹہ لگا ہیں۔ خیالات کی اس تبدیلی نے اُن کی زندگی اور زیادہ تلخ کر دی تھی اور وہ ہر وقت اسی اُدھیڑ بُن اور پیچ و خم میں پڑے رہتے تھے۔

۳۔ مہاجن کی طرف سے نوٹس

ایک روز نشست گاہ میں احباب کا مجمع تھا کہ ڈاکیے نے سب کے سامنے ایک رجسٹری شدہ نوٹس لا کر دیا جس کا مضمون یہ تھا کہ ''آپ کے رقعہ کی میعاد عنقریب منقضی ہونے والی ہے اس لیے ایک ہفتہ کے اندر روپیہ ادا کر دیا جائے ورنہ مجبوراً عدالت سے چارہ جوئی کی جائے گی''۔ نوٹس دیکھ کر مفتی محی الدین کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا پوسٹ مین جب آیا تو سب لوگ ہنس بول رہے تھے مگر اب تمام مجلس میں سناٹا ہو گیا اس افسردگی کو دیکھ کر حاضرین ایک ایک کر کے کھسک گئے مفتی صاحب خلاف معمول پلنگ پر جا لیٹے۔ دماغ چنتا کھاتے کھاتے بیکار ہو گیا تھا۔ کچھ غنودگی طاری ہوئی تو دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے ایک سبز پوش پیر مرد کھڑے ہیں۔ محی الدین ہر چند پلنگ سے اٹھ کر اُن کے سامنے مؤدب کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا۔ عرض حال کرنا چاہتے ہیں۔ مگر زبان یاوری نہیں کرتی بالآخر پیر مرد ہاتھ بڑھا کر مفتی صاحب کے سینہ پر رکھ دیتے ہیں اور تسلی دے کر فرماتے ہیں کہ ''بیٹا گھبراؤ مت صبر و شکر سے کام لو''۔

۴۔ پیر مرد سے مکالمہ

''حضور! اب تو صبر کی طاقت باقی نہیں رہی''

پیر مرد: صبر و شکر کے الفاظ تمہارے لیے محض برائے گفتن نہیں ہیں۔ تمہاری نظر اب تک اپنی ذات اور خاندان تک محدود ہے تم نے نہیں

کہ دنیا میں لوگوں پر کیسے کیسے سخت مصائب گزرے ہیں انبیا اور اولیا جو خدا کے محبوب بندے ہوتے ہیں انھوں نے کیسی کیسی تکالیف اٹھائی ہیں اور آج نہیں کل دنیا میں ہزاروں آدمی بے آب و دانہ مر جاتے ہیں۔ تمھارے پاس تو خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ تم زیادہ تر تو تخیلات و توہمات کے شکار بن رہے ہو (بس)۔

مفتی صاحب: حضور نے بالکل درست فرمایا ہے میں در اصل شدید احساس کا مریض ہوں۔ میں خود واقف ہوں کہ میرے دوسرے بھائیوں کی کیا حالت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں صاحبِ جائداد ہوں فصل کے وقت سال میں دو بار صدہا من غلہ اور ہزارہا روپیہ میرے ہاتھوں میں آتا ہے اور ضرورت ہو تو رقعہ پر ورنہ جائداد کی کفالت پر قرض بھی مل سکتا ہے۔ اس وقت صدہا شریف مسلمان اور ذی حیثیت مسلمانوں کی بیوہ عورتیں نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ اس زمانہ کی عدالتوں کا منظر میرے سامنے ہے دستاویزوں میں راہن کون ہیں؟ ہمارے بھائی مسلمان۔ مدیون کون ہیں؟ مسلمان۔ بائع کون ہیں؟ مسلمان نذرانہ لے کر استمراری پٹہ دینے والے کون ہیں؟ مسلمان۔ دیوانی میں مدعا علیہ کون ہیں؟ مسلمان۔ مدیون ڈگری کون ہیں؟ مسلمان۔ ڈگری یوں میں گرفتار ہو کر جیل میں جانے والے کون ہیں؟ مسلمان۔ پھر اسی کے ساتھ وہ ان باتوں کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ کچھ پروا بھی نہیں کرتے۔ انھیں مقدما ملتوی کرانے، سمن اور وارنٹ بلاتعمیل واپس کرا دینے کی صدہا ترکیبیں یاد ہیں حتیٰ کہ دھوکہ میں گرفتار بھی ہو جائیں تو استنجا کرنے یا نماز پڑھنے کے بہانہ سے سپاہیوں کو چکمہ دے کر ان کی حراست میں سے نکل بھاگتے ہیں

اور پھر برادری میں بیٹھ کر اُس پر فخر کیا کرتے ہیں۔

مگر حضور والا میں جو کچھ دیتا ہوں اور دن رات گھُلتا ہوں وہ اسی خیال اور تصور سے کہ بالآخر میرا بھی یہی انجام ہونے والا ہے۔

پیر مرد۔ خدا کا شکر ہے کہ تم میں غیرت و حمیت باقی ہے۔ ذکی الحس ہونا عین ایمان کی نشانی ہے بشرطیکہ وہ حد سے تجاوز کر کے دماغ میں اختلال نہ پیدا کر دے۔ اس کے لیے تم اِذَا اَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا کرو۔

۵۔ عالمِ ارواح میں افسردگی

پیر مرد کے دلاسہ دینے سے مفتی محی الدین میں کچھ جان پڑی اور انھیں اُمید ہوئی کہ ان بزرگ سے ضرور عقدہ کشائی ہوگی اور جس مسئلہ نے مفتی جی کے دماغ میں جگہ ڈال رکھا تھا وہ اب حل ہو جائے گا۔ کیونکہ مفتی صاحب کا یہ خیال اب پختہ ہو گیا تھا کہ خود اُن کی اور نیز عام طور پر مسلمانوں کی گداوغلامی بغیر روپیہ پیسہ کا رویہ شروع کیے نہ ہوگی۔ ان خیالات کے ساتھ مفتی صاحب ہمت کر کے پلنگ سے اُٹھے اور مؤدب ہو کر پیر مرد کے سامنے کھڑے ہو گئے اور عرض کی۔

مفتی صاحب۔ "حضور پر تو ہمارے تمام حالات روشن ہیں۔ برائے خدا ہمیں اس کشمکش سے جلدی نکالیے"

پیر مرد۔ جی نا سمجھ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں علام الغیوب ہوں یا تمہاری کسی طرح مدد کر سکتا ہوں۔ حاشا و کلا۔ ہم بھی خداوند تعالے کے دیسے ہی محتاج

بندے ہیں جیسے کہ تم ہو۔ البتہ اُس نے اپنے فضل سے ہمیں آلام و افکار اور تمام دنیوی آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک کر دیا ہے۔ اور یوم الحساب تک کے لیئے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے دی ہے۔ ہمیں دُنیوی حالات کے معلوم ہونے سے سخت تکلیف ہوتی ہے اسی لیئے ہم کبھی اُن کے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے مگر باوجود ہمارے استغنا اور بے تعلقی کے دُنیا میں اُمّتِ محمّدیہ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو بوجہ روحانی تعلقات کے عالمِ ارواح میں اُس کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے سے عالمِ ارواح میں عالمِ افسردگی طاری ہے جس سے متاثر ہو کر میں نے چاہا کہ تم لوگوں سے کچھ حالات معلوم کروں پس جن مصائب میں تم لوگ مبتلا ہو اُنھیں کسی قدر وضاحت سے بیان کرو۔“

مفتی صاحب ”حضورِ والا کے سامنے مسلمانوں کی عام قرضداری کا کچھ مختصر خاکہ تو پہلے پیش کر چکا ہوں اور قرضداری سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں اُن کا ظہور بھی بدرجۂ اتم ہماری قوم میں ہو چکا۔ یعنی کثرتِ افلاس سے اخلاقی اور مذہبی تنزل کی کوئی حد و انتہا باقی نہیں رہی۔“

پیر مرد ”تمھارے کہنے سے خیال آتا ہے کہ عام قرضداری تو غالباً میرے زمانہ میں بھی شروع ہو چکی تھی مگر اُس کے ساتھ ذرائعِ معاش اتنے تھے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ مل رہتا تھا۔“

مفتی صاحب ”مختصر طور پر عرض ہے کہ جب سے انگریزی تعلیم کا رواج شروع ہوا۔ مسلمان سرکاری عہدوں اور دفاتر سے خارج ہونے لگے

زمینداریاں اور جائدادیں قرضہ میں نکلنے لگیں۔ تجارت اور صنعت پر روپیہ والوں کا تسلط ہوگیا اور انجام کار ہر شعبہ زندگی میں مسلمان دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام ہوگئے۔ اور جسمانی غلامی کے ساتھ دماغی اور روحانی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جاتے ہیں یعنی یہ کہ مسلمان اب افلاس سے تنگ آکر تبدیل مذہب کر رہے ہیں۔ اور آہستہ سے عرض کرنے کی بات یہ ہے کہ روپیہ کے زعم میں اب خود ہندو مسلمانوں پر اور ان کے معابد پر چڑھ کر آتے ہیں۔ حملہ کی ابتدا خود کرتے ہیں اور روپیہ کے زور سے مسلمانوں کو عدالتوں سے سزائیں کرا دیتے ہیں جس سے پھر مسلمانوں کو سر اٹھانے کی مہلت نہیں ہوتی اور اب وہ نقصانات کے خوف سے پست ہمت و بزدل ہوتے جاتے ہیں اور میلوں ٹھیلوں کے وقت اپنا منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔"

پیر مرد "میں تمھاری سب باتیں سمجھتا ہوں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سرمایہ داری کیا چیز ہے جو سب شعبہ جات زندگی پر حاوی اور غالب ہو رہی ہے۔"

۲۔ سرمایہ داری کی تشریح

مفتی صاحب "حضور والا۔ یہ زمانہ حال کا سب سے زیادہ کاری آلہ ہے۔ اس وقت سے ایک سو سال قبل تجارت کے معنی یہ سمجھے جاتے تھے کہ جتنے داموں میں کوئی چیز خریدی جائے اس پر کچھ منافعہ لگا کر فروخت کر دی جائے ایک مقام سے کوئی چیز خریدی جائے کسی دوسرے مقام میں جہاں وہ پیدا نہ ہوتی ہو لے جا کر کسی قدر اضافہ سے بیچ دی جائے۔ کاری گری کے معنی یہ تھے کہ تمام و

محنت کر کے جو چیز تیار کی جائے شام کو مقامی لوگوں کے ہاتھ اسی طرح فروخت کر دی جائے جیسے کہ دن بھر گھاس کھود کر شام کو بیچ دی جاتی ہے۔ مگر اب وسائل سفر اور ذرائع خبر رسانی کی سہولت کی وجہ سے تمام دنیا مثل ایک بازار کے ہو گئی ہے۔ اور یہ بازار اور تمام مصنوعی اور قدرتی پیداوار کا نرخ روپیہ والوں کے ہاتوں میں آ گیا ہے۔ اور نہ صرف مختلف پیشہ ور بلکہ سلطنتیں بھی انہیں روپیہ والوں کے زیر اثر اور اُن کی دست نگر ہیں۔ جو ہر ہر لمحہ کے حساب سے اپنے روپیہ کا استعمالی کرایہ لگاتے ہیں

مگر بد قسمتی سے مسلمان روپے کے ہر قسم کے کرایہ کو سود سمجھ کر اُس کے لینے سے بچتے ہیں مگر دینے پر مجبور ہیں اور خوب دیتے ہیں۔

پھر میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ یہ ربوا کس طرح ہے یہ تو باہمی طور پر مضاربت ہے اور اُس سے فریقین کو نفع ہی نفع ہے۔ اگر کوئی شخص دوسرے شخص کو ذاتی کاموں میں صرف کر ڈالنے کے لیئے روپیہ دے اور اُس پر اپنا منافع لگائے تو بے شک مدیون کے لیئے ادائیگی مشکل ہو جاتی ہے۔ مگر کسی دوکاندار یا کاریگر کو اگر اس غرض کے لیئے روپیہ دیا جائے کہ وہ کاروبار میں لگا کر اس سے اور زیادہ روپیہ پیدا کرے تو اس میں نہ دائن خسارہ میں رہتا ہے اور نہ مدیون اگر اس مضاربت کو ناجائز ٹھیرایا جائے تو زرعی اراضی پر جو لگان لیا جاتا ہے وہ تو بالکل ہی ناجائز ٹھیرا جو ایک معین رقم ہوتا ہے کاشتکار کو زمین سے کچھ پیداوار ملے یا نہ ملے۔ البتہ یہ بھی نفع کے کاموں سے مسلمانوں کو محروم کرنا

اور روکنا درحقیقت انھیں ہلاک کردینا اور اُن کی قومیت کو فنا کردینا ہے جو حالات تم نے بیان کئے ہیں اُن کی موجودگی میں تو روپیہ کا کاروبار کرنے روپیہ کا تجارتی منافعہ لینے سے بڑھ کر کوئی ثواب کا کام نہیں معلوم ہوتا اور جبکہ بقول تمھارے مسلمان افلاس کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں رہتے کہ اپنے مذہب اور اپنے معابد کی حفاظت کرسکیں تو روپیہ سے روپیہ پیدا کرکے قومی قوت حاصل کرنا عین جہاد ہے۔"

پیرمرد کے یہ الفاظ سن کر مفتی جی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو جاری تھے اور زبان سے الحمدللہ جزاک بارک اللہ کے الفاظ بے اختیار نکل رہے تھے۔ اسی دوران میں مفتی جی کو خیال آیا کہ استفتار لکھ کر پیرمرد سے فتوے لکھا لیا جائے چنانچہ جھٹ پٹ حسب ذیل فتویٰ لکھ کر پیرمرد کے سامنے پیش کر دیا۔

استفتار کیا فرماتے ہیں علمار دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسلمان کاشتکار اور سکاری گروہ کاندار اور کارخانہ دار اپنا کاروبار چلانے کے لئے قرضہ لینے پر مجبور ہیں اور چوں کہ اس زمانہ میں بلا سودی قرضہ دستیاب نہیں ہوتا اس لیے اہل ہنود سے سودی قرضہ لیتے تھے۔ مگر اب مذہبی اختلافات کی وجہ سے اکثر مقامات میں اہل ہنود نے مسلمانوں کو قرض دینا بند کردیا اور اپنے پچھلے قرضہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس دباؤ میں اُن کی اشدھی کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ اشدھی نہیں ہوتے اُن کا سامان اور گھربار نیلام کراکر انھیں برباد کردیتے ہیں ان حالات میں کیا یہ

امر جائز ہے کہ مسلمان ایسے لوگوں کی امداد اور دستگیری اس طریقہ پر کریں کہ انھیں معین منافعہ پر روپیہ دیں یا اُن کے ساتھ مضاربت یہ رقم معین کریں جس طرح سے کہ معین لگان پر کاشت کے لیئے آراضی دی جاتی ہے اور اس طریقہ سے انھیں غیر اقوام کے سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد کرائیں تاکہ ان کا کاروبار نہ بگڑے اور وہ مذہبی ارکان آزادی سے ادا کرتے رہیں اور تبدیل مذہب پر مجبور نہ ہوں۔

۶۔ پیر مرد غائب ہو گئے

یہ استفتا پڑھ کر پیر مرد نے آہ سرد کھینچی اور کہا کہ میں اگر عالم اجسام میں ہوتا تو تم لوگوں کی یہاں تک نوبت کیوں آ پہنچی ہوتی جس چیز کا فتویٰ تم مجھ سے طلب کرتے ہو وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ اس زمانہ میں یہی جہاد اکبر ہے اور سب سے بڑے ثواب کا کام ہے میں نے تو اس وقت سے ایک سو سال قبل ایک نہیں چار فتوے اور وہ بھی تجارتی سود کے جواز کے نہیں بلکہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر ربوا کے جواز کے بارے میں دیئے تھے کہ مسلمان غیر مسلموں سے آزادی سے لیں بلکہ میں نے غیر مسلموں سے سود لینے کو سود دینے پر ترجیح دی تھی۔ مگر اب تو میں عالم ارواح میں ہوں تمھارے کاغذ پر کس طرح لکھوں۔

پیر مرد نے اپنی تقریر تمام نہیں کی تھی کہ مفتی محی الدین کو یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ بزرگ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی ہیں جنھوں نے غیر مسلموں سے سود لینے کا فتویٰ دیا تھا یہ سوچ کر بے اختیار

اُن کے قدموں کی طرف ہاتھ بڑھائے کہ وہ پیر مرد پیچھے ہٹ کر دفعتاً غائب
ہو گئے اور محی الدین دیکھتے کیا ہیں کہ اپنے پلنگ پر سے ہاتھ پھیلائے اُٹھ
رہے ہیں اور صبح کی اذانوں کی آواز آرہی ہے اس مبارک خواب نے محی الدین
کے تمام شکوک رفع کر کے اُن میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ انھوں نے اس امر
کا خوب اندازہ کر لیا کہ سود انھیں لوگوں پر سوار ہو کر اُنھیں تنگ کرتا اور اُن
پر غلبہ حاصل کرتا ہے جو اُس سے بچتے ہیں۔ اس لیئے اُنھوں نے سود پہ غلبہ حاصل
کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انھوں نے مہاجن کو جس کے رقعہ کا مطالبہ تھا بلا کر فوراً تمسک
لکھ دیا اور رقعہ کے روپیہ سے زیادہ روپیہ لیا جس سے تمام متفرق زیورات کو
جو زیادہ شرح سود پر رہن رکھے تھے چھوڑا لیا۔ اور فاضل روپیہ سے اپنے
عزیزوں کے زیورات بازار سے چھوڑا کر کم شرح سود پہ اپنے پاس رکھ لیئے
مفتی جی کے تقدس کا عام اثر تھا جس سے بھائی بندوں نے اُن کے خواب
کو صحیح سمجھا اور سب نے مل کر حسب حیثیت روپیہ جمع کر کے ایک سرمایہ محض
اس لیئے مخصوص کر دیا کہ اپنی برادری کے لوگوں کا زیور رہن ہونے کے لیئے
بازار میں نہ جانے پائے اور جسے ضرورت ہو بارہ آنے سیکڑہ پہ مشترک سرمایہ
سے بہ کفالت زیور قرض لے۔ پھر مفتی جی نے غریب مسلمان ساری گروں کو مشترک
اور ذاتی سرمایہ سے مضاربت بر قسم معین پر اور کم شرح سود پہ روپیہ دینا شروع
کیا۔ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب کو جو ضلع میرٹھ کے دیہات میں دورہ کر کے
بینک قائم کر رہے تھے بلا کر مسلم بینک زمینداران کی بنیاد قائم کی۔ [illegible]
اور [illegible] کے سرمایہ کو جو ایک تاجر کے پاس بیکار پڑا تھا لے کر بینک میں رکھا اور

اُس سے مستقل آمدنی کی صورت پیدا کردی۔ بچوّں کے لیئے گولکیں بنا دیں جنمیں وہ پیسے ڈالتے رہیں اور جب چار آنے ہوجاتے تو ڈاکخانہ میں داخل کراتے اور جب معید ہوجاتے تو اُن کے کیش سرٹیفکیٹ خرید وادیئے جاتے اس لئے بچوّں کا چٹورپن چھوڑا دیا اور اُنھیں کفایت شعار بنا دیا۔ اس کے علاوہ بچوّں کا تعلیمی بیمہ کرا دیا تاکہ اُن کی تعلیم کی طرف سے اطمنان ہو جائے غرض کہ مفتی صاحب قرضداری کے بار سے روز بروز سبکدوش ہوتے جاتے ہیں اور وہ اور اُن کا خاندان جو بربادی کے کنارے آلگا تھا اب فارغ البالی کی طرف قدم بڑھا کر دین داری کی زندگی بسر کر رہا ہی۔

جنوری ۱۹۲۶ء

---

(۲۶)

سود

بدترین چیز ہی

جبکہ اُسے کچھ لوگ لیں اور کچھ لوگ نہ لیں

(کیونکہ جب سود دینے والے کم اور لینے والے زیادہ ہوتے ہیں تو شرح سود زیادہ ہوتی ہی۔

بہترین چیز ہی

جب کہ اُسے سب لوگ عام طور پر لیں

(کیوں کہ بہت سے لوگوں کا روپیہ سود پر اُٹھنے کی وجہ سے شرح سود عام طور پر بہت گھٹ جاتی ہی جو ملک و قوم کے لیئے سراسر مفید ہی۔

۲۔ شرح سود زیادہ ہونے سے کاروبار اور صنعتی کام کرنے والوں کو جو قرض لیکر کام کرتے ہیں زیادہ سود دینے کے بعد بہت کم بچتا ہے۔

۳۔ اور کاریگروں کی محنت کا زیادہ تر حصہ سود لینے والوں کے پاس چلا جاتا ہے جس سے روپیہ والے مالا مال ہوجاتے ہیں۔

۴۔ اور قرض لے کر کام کرنے والے بے نتیجہ محنت کرتے کرتے دل شکستہ، مسرف اور ناعاقبت اندیش ہوجاتے ہیں۔

۵۔ ایک طبقہ میں حد سے زیادہ دولت جمع ہوجانے اور دوسرے طبقہ میں حد درجہ افلاس ہونے سے ملک میں دو جداگانہ اور بیگانہ طبقات پیدا ہوجاتے ہیں۔

۲۔ اس سے کاروبار کرنے کے لیئے لوگوں کو روپیہ بافراط ملتا ہے۔

۳۔ اور کم سود دینے کی وجہ سے انھیں کام کرنے میں زیادہ بچت رہتی ہے اور کام کا معاوضہ اچھا ملتا ہے۔

۴۔ اس سے کام کرنے والوں کو زیادہ محنت کرنے اور زیادہ کفایت شعاری کرنے کی رغبت ہوتی ہے۔

۵۔ کسی ایک طبقہ میں حد سے زیادہ دولت جمع نہیں ہونے پاتی جس سے سوسائٹی میں زیادہ مساوات رہتی ہے اور سب کی اخلاقی حالت بہتر اور بلند ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ انجمنہائے امداد باہمی جن میں ہر ہر فرد سود لیتا ہے ایکدوسرے کی مدد

۶ - طبقہ اعلیٰ میں نخوت اور غرور اور غربا کی تحقیر کا خیال پیدا ہو جاتا ہے اور طبقہ ادنیٰ میں پست ہمتی اور افلاس کی وجہ سے تنگ نظری آ جاتی ہے نیک کاموں میں صرف کرنے کی رغبت نہیں ہوتی اور عام اخلاقی حالت پست ہو جاتی ہے

اور ہمدردی کرنے کی بہترین مثالیں ہیں۔

۶ - اس سے عام خوش حالی اور خوش حالی کی وجہ سے نیک کاموں میں روپیہ صرف کرنے میں بہت لطف آتا ہے اور ایسی سوسائٹی سے خیرات مثل چشمہ کے ابلتی ہے۔

پس ہندوستان کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر جلد سے جلد روپیہ کا کاروبار جاری کریں تاکہ بازاروں میں زیادہ روپیہ پہنچنے سے کاروبار میں شرح سود گھٹے اور اس سے صنعت و تجارت میں ترقی ہو، نفع خلائق کے کام کثرت سے جاری ہوں اور ملک خوش حال ہو۔

جنوری ۱۹۲۷ء

---

(۳۷)

کفایت شعاری کا نصاب تعلیم

اصلاح رسوم اور کفایت شعاری، صنعت و حرفت اور تجارت میں ترقی کرنے کی جس قدر خواہش مسلمانوں کو ہے وہ کسی اور قوم سے کم نہیں ہے۔ بہت سے مسلمان

ایسے ہیں جو اپنے اخراجات میں کفایت کرتے ہیں مگر ایک کھڑکی بند ہوتی ہے تو خرچ کے چار دروازے اور کھل جاتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں اندازاً اثاثہ سے، یا قرض لیکر یا جائداد بیچ کر دوکان کھولتے، تجارت کرتے، کارخانے قایم کرتے ہیں مگر چند روز بعد سب ختم کرکے مایوس ہو بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھیں ابتدا سے کفایت شعاری کی تعلیم نہیں ہوئی۔ ابجد وہ پڑھے ہوتے نہیں۔ اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں اول ہی امتحان دیتے ہیں اس لیئے لامحالہ ناکام ہوتے ہیں۔ پس ہم ابجد سے کفایت شعاری کا نصاب قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ واقفکار اصحاب اس میں مناسب ترمیمات کرلیں۔

نصاب

(۱) مکان میں ہر بچہ کی گولک علٰحدہ علٰحدہ بناکر اُس کو اس شرط پر پیسے دینا کہ وہ اُن میں سے کچھ پیسے اپنے ہاتھ سے گولک میں ڈالا کرے۔ اور اُس پر بچّے کو انعام دینا۔

(۲) جب چار آنہ گولک میں جمع ہوجائیں تو بچہ کو ڈاکخانہ ساتھ لے جاکر اُس کے نام سے حساب کھلوانا اور خود اُس کے ہاتھ سے جمع کرانا۔

(۳) جب ساڑھے سات روپیہ جمع ہوجائیں تو بچے کے نام سے ایک کیش سرٹیفکٹ خریدنا جس کے پانچ سال میں دس روپیہ ہوجاتے ہیں۔ اور اسی طرح حسب حیثیت اور بڑی تعداد کے سرٹیفکٹ اس کے نام سے خریدتے رہنا۔

(۴) ہر بچہ کا تعلیمی بیمہ کرانا۔

(۵) اپنے پس ماندگان کے لیئے اپنی زندگی کا بیمہ کرانا۔ ملازمان سرکار ڈاکخانہ میں بھی بیمہ کرا سکتے ہیں جس کی قسطیں ماہوار تنخواہ سے منہا ہوتی ہیں۔

(۶) اگر ملازم ہو تو پراویڈنٹ فنڈ میں سے تنخواہ کا ایک حصہ منہا کرانا۔

(۷) خود اپنا حساب ڈاکخانہ یا کسی معتبر بینک میں کھولنا (ڈاکخانہ میں ۳ فی صدی منافعہ ملتا ہے اور امپیریل بینک کے سیونگ میں چار فی صدی منافع ملتا ہے۔ سیونگ بینک میں ایک سال میں پانچ ہزار تک جمع ہو سکتا ہے۔ جب اس سے زیادہ ہو جائے تو محفوظ فنڈ میں منتقل ہو کر ۴ ½ فی صدی منافعہ مل سکتا ہے۔ جب زیادہ روپیہ بڑھتا جائے تو اس سے امپیریل بینک کے جو معتبر ہیں حصے خریدے جا سکتے ہیں جن کا منافعہ ۱۶ فی صدی سے زیادہ ملتا ہے یا ایک سال کی واپسی کی شرط پر جمع ہو سکتا ہے (شرح سود بدلتی رہتی ہے روپیہ جمع کرتے وقت اس کی تحقیق کر لی جائے)

(۸) جب محفوظ بینکوں میں کافی روپیہ ہو جائے تو اُس کا ایک جزو غریب کاریگروں اور دوکانداروں اور کاشتکاروں کو معین منافعہ پر، یا قسطوں پر عام شرح سود سے کم پر دینا تاکہ وہ دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کی غلامی سے نکلیں مگر غیر نفع آور کام کے لیئے یا اسراف اور شادی غمی میں صرف کر ڈالنے کے لیئے نہ دیا جائے کیوں کہ اُس کا سود ربا ہوگا جو حرام ہے۔ صرف کاروبار کرنے کے لیئے کم سود پر دیا جائے۔

(۹) کاشتکاروں اور کاریگروں کی انجمنہائے امداد باہمی قائم کرنے میں خاص کوشش کرنا اور اس میں نمایاں حصہ لینا اور اپنی ذاتی ضروریات کے لیئے اپنی جماعت اپنے محلہ میں کوآپریٹو اسٹور (یعنی باہمی شرکت کی دوکان)

کھولنا۔

(۱۰) انفرادی اور اجتماعی طور پر روپیہ کا کاروبار کرنا، صنعتی کارخانے اور دکانیں کھولنا اور وسیع پیمانہ پر اپنے ملک میں اور دیگر ممالک میں ہر قسم کی تجارت کرنا جس سے حقیقی طور پر سوراج حاصل ہوتا ہے اور اپنی قومی اور ملکی سلطنت قائم ہوتی ہے اور دوسری کمزور سلطنتوں پر قبضہ حاصل ہوتا ہے اور اپنا قومی وقار قائم ہوتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۶ء

---

(۲۸)

دولت کی برائی کون لوگ کرتے ہیں؟

(۱) وہ لوگ جو روپیہ پیدا کرنے، اور بچا کر اسے بڑھانے کے طریقوں سے واقف نہیں ہیں اور دولت مند بننے میں ناکام رہتے ہیں اس لیے وہ رشک کی وجہ سے دولت اور اہل دول کی برائی کرتے ہیں۔

(۲) یا وہ تارکان دنیا دولت کی برائی کرتے ہیں جن کی تمام ضروریات جو روپیہ سے خریدی جاتی ہیں، دوسرے لوگ ان کے لیے فراہم کر دیتے ہیں۔

مگر اب مسلمان اس قدر مفلس ہو گئے

کہ ان میں گوشہ نشین اصحاب کی ضروریات فراہم کرنے اور ان کی خدمت کرنے والوں کی نہایت کمی ہو گئی ہے۔ اس لیے اب جو لوگ مسلمانوں میں دولت کی برائی کرتے ہیں وہ یا تو رشک سے کرتے ہیں یا محض وضعداری سے۔

(۲۹)

پنجاب کے مسلمان زمینداروں کی اقتصادی حالت

(یہ وہ تقریر ہے جو سید طفیل احمد صاحب نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کے جلسہ انجمن حمایت اسلام لاہور میں کی)

۱۔ معذرت میں اراکین انجمن حمایت اسلام کا دلی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے کرم سے مجھے آج دوسری بار اپنے خیالات مسلمانوں کی مالی حالت کے متعلق عرض کرنے کا موقع دیا ہے اگرچہ مجھے اسی کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ مجھے آپ کے سامنے نہایت خشک اور دلوں کو افسردہ کرنے والے واقعات عرض کرنے پڑتے ہیں تاہم اس قدر عرض کرنے کی میں ضرور جرأت کرتا ہوں کہ جس مسئلہ کو میں ایک عامیانہ طریقہ سے پیش کرتا ہوں اگر اس کی طرف پنجاب کے ذی علم، ذی رتبہ اور قابل اصحاب کو توجہ ہوگئی تو کچھ مدت بعد آپ دیکھیں گے کہ جو مصائب آپ کو انجمن اور اسلامیہ کالج کے لیے سرمایہ فراہم کرنے میں اٹھانے پڑتے ہیں اُن میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی اور نہایت کم کوشش سے آپ کو اور آپ کی آئندہ نسلوں کو یہ افراط روپیہ ملا کرے گا۔

مسلمانوں کا ایک وہ زمانہ تھا جب کہ لوگ جھولیوں میں سونا بھر کر مدینہ منورہ کی گلیوں میں پکارتے پھرا کرتے تھے اور اس کا کوئی لینے والا نہ ملتا تھا۔ برخلاف اس کے اب اسکول کے بچوں سے لے کر قوم کے معزز ترین اصحاب

تک چندہ کے لیئے گھر گھر مارے پھرتے ہیں اور تنخواہ دار سفیر بھیج کر ہزاروں روپیہ صرف کرتے ہیں مگر قوم کی نہ مقامی ضروریات پوری ہوتی ہیں اور نہ مرکزی۔ مغربی ممالک کی نسبت یہ سنا جاتا ہے کہ جب وہاں کوئی نفع عام کا کام جاری ہوتا ہے تو پبلک کو محض اخبارات کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ فلاں کام کے لیئے روپیہ کی اس قدر ضرورت ہے۔ اسی وقت لاکھوں کے چیک آنے شروع ہو جاتے ہیں اور چند روز میں فہرست مکمل ہو جاتی ہے۔ چند سال ہوئے لندن کے ایک گوشہ کی طرف جو ہمسیڈ کے نام سے مشہور ہے کوئی جنگل واقع تھا اُسے صاف کر کے آباد کرنے کی ضرورت ہوئی۔ صرف ایک شخص نے بلا اظہار نام کے آٹھ لاکھ روپیہ کا چیک بھیج دیا اور کام پورا ہو گیا اور محض جنگل کی صفائی کے لیئے یہ رقم مل گئی اور تعلیمی اور خیراتی کاموں کے لیئے تو کروڑوں روپیہ ہر طرف سے برستا رہتا ہے یہ خبریں ہماری سمجھ میں تو کسی طرح آتی نہیں کیوں کہ یہاں تو جو لوگ پبلک کام کرتے ہیں ان کی قوت اور عمر کا بہترین حصہ ذلیل قسم کی چاپلوسی، خوشامد اور گداگری میں گذر جاتا ہے اور پھر بھی دُنیا سے مایوس جاتے ہیں۔ بہرحال قومی کاموں کے لیئے چندہ وصول کرنے میں جو روحی تکالیف پیش آتی ہیں اور جو خرچ پڑتا ہے اُن کی تفصیل کے لیئے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہوں گے۔ اس لیئے میں اختصار کے ساتھ صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ یہ تمام تر مصائب ہمارے افراد کی ناداری کے نتیجے ہیں جس کے دور کرنے کی طرف ہمیں جلد سے جلد متوجہ ہونا چاہیئے۔

سال گزشتہ کے مضمون میں جو میں نے مسلمانان پنجاب کی اقتصادی

حالت کے متعلق آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس میں میں نے زمینداروں کی حالت کو دانستہ نظر انداز کر دیا تھا۔ کیوں کہ اس کے لیے ایک مستقل مضمون کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اب میں صرف پنجاب کے مسلمان زمینداروں کی نسبت عرض کرنا چاہتا ہوں جو ہماری سوسائٹی کی سب سے اہم جماعت ہے۔ سب سے اہم اس لیے کہ زمینداری سلطنت سے اشبہ، سلطنت کی جزو اعظم اور سلطنت سے قریب تر ہے۔ اس صوبہ میں مسلمان عرصہ دراز سے زمین پر قابض تھے چنانچہ اب تک زمینداری اور کاشتکاری میں اُن کی تعداد چھپن فی صدی یا نصف سے زیادہ ہے۔ اور بعض کتابوں میں میں نے دیکھا ہے کہ دو ثلث کے قریب ہے۔

پھر یہ کہ کاشت کے مواقع کے اعتبار سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دنیا بھر میں پنجاب کی برابر زرخیز کوئی صوبہ نہیں ہے۔ اور اب بیس ہزار میل کی نہروں نے ترقی کے وسائل کو بدرجہا زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے بحیثیتی زمیندار اور کاشتکار ہونے پر ان بے نظیر مواقع سے کہاں تک فائدہ اُٹھایا ہے۔

۲۔ انگریزی عملداری سے قبل اس امر کے جانچنے کے لیے ہمیں چند دور قایم کرنے پڑیں گے۔ پہلا دور انگریزی عملداری سے پہلے کا تھا جب کہ زمین کی مالک سلطنت تھی اور زمیندار کو اراضی پر حقوق مالکانہ اور حقوق انتقال حاصل نہ تھے اور وہ مثل ایک مستاجر کے تھا۔ اُن دنوں کاشت سے جو کچھ پیدا ہوتا کاشتکار اس کا ایک حصہ زمیندار کو

اور زمیندار حاکم وقت کو دیتا تھا اگر کچھ پیدا نہ ہوتا تو کچھ نہ دیتا۔ اس وقت آراضی کا محصول بھی نقدی کی صورت میں نہ دینا پڑتا تھا اور اس لیئے مہاجن سے روپیہ قرض لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی اگر ضرورت پڑتی تو زیادہ تعداد میں روپیہ نہ مل سکتا تھا۔ اور جس قدر ملتا تھا تو اس کی شرح سود ایک روپیہ سیکڑہ سے لیکر زیادہ سے زیادہ دو روپے سیکڑہ تک ہوتی تھی حتیٰ کہ معزز مہاجنوں میں دو روپیہ سیکڑہ سے زیادہ سود لینا معیوب سمجھا جاتا تھا جس کی تصدیق کرنیل ویس نے جو پنجاب کے ایک سویلین تھے کی ہے۔

۳۔ آراضی میں حقوق مالکانہ ملنے کا دور

دوسرا دور اس صوبہ میں انگریزی عملداری سے شروع ہوتا ہے جب کہ ۱۸۳۹ء میں گورنمنٹ نے بجائے جنس کے نقد مالگذاری مقرر کردی اور زمینداروں کو اپنی مقبوضہ آراضی رہن اور بیع کرنے کے اختیارات دے دیئے۔ رہن اور بیع کے اختیارات نے رعایا کی مالی حیثیت کو دس گونہ سے لیکر بیس گونہ تک بڑھا دیا جن لوگوں کو بمشکل بیس روپیہ قرض مل سکتے تھے انھیں آراضی کی کفالت پر صدہا روپیہ ملنے لگا۔ سرکاری لگان ادا کرنے کے لیئے قرض، روزمرہ کی ضروریات کے لیئے قرض، شادی اور غمی کی تقریبات کے لیئے قرض حتیٰ کہ اسراف اور عیش پرستی کے لیئے قرض ملنے لگا اور زر قرضہ پر سود، سود در سود اس کے بعد ڈگری اور ڈگری کے بعد نیلام کی نوبت آنے لگی۔

تمام سرکاری رپورٹوں میں تحریر ہے کہ مسلمان ابتدا سے روپیہ رکھنا

نہ جانتے تھے۔ پہلے انھیں قرض نہ مل سکتا تھا اس لیے اگر کھانے کو نہ ملتا تو بھوکے رہتے۔ مگر اس تبدیلی سے انھیں تو اس سے خوشی ہوئی کہ خوب قرض ملنے لگا جس سے وہ سمجھے کہ وہ بڑے دولتمند ہو گئے اور مہاجنوں کو اس سے خوشی ہوئی کہ قرضہ کے بدلے میں اُن کے ہاتھ جائدادیں آنے لگیں اور تھوڑے عرصہ میں بڑے بڑے زمیندار بن گئے۔

۴۔ شرح سود کی آزادی کا اثر

چونکہ زمینداریوں کے انتقال میں سودی کاروبار کا بڑا حصّہ تھا اس لیے سود کے متعلق چند تاریخی واقعات عرض کرنا غالبًا بے موقع نہ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ سود چونکہ انسانوں کی صرف ایک محدود تعداد کے لیے نفع بخش اور زیادہ کے لیے مضر اور ان کی بربادی کا باعث تھا اس لیے اس کی ممانعت ہر قوم و مذہب میں تھی۔ دُنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں سود ممنوع اور معیوب شمار رہا ہو۔ اُسے مذہبی اور ملکی قوانین دونوں نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کبھی نہ رُک سکا بلکہ ممانعت سے اس کی شرح بڑھ جاتی تھی کیونکہ جب لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اُن کے روپیہ کا سود علانیہ وصول نہیں ہو سکتا تو اس کی وصولی مشتبہ ہونے کی وجہ سے شرح سود بڑھ جاتی تھی۔ بالآخر بہت سے تجربوں کے بعد انگلستان میں ۱۵۴۵ء میں شرح سود کی حد دس فی صدی مقرر کی گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ یورپ میں سودی قرضہ زیادہ تر غربا اور ضرورت مند لوگ لیتے تھے اور اس سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے تھے۔ مگر جب صنعتی کاروبار کا دور شروع ہوا تو روپیہ کاروبار تجارت اور کارخانوں میں لگانے

کے لیے قرض لیا جانے لگا جس میں قرض دینے والے اور لینے والے دونوں کا
نفع تھا اس نے ملک کی دولت میں اضافہ کیا جس سے شرح سود خود بخود
کم ہونے لگی۔ اسے دیکھ کر انگلستان میں سلطنت نے ۱۶۲۴ء میں شرح سود
دس فی صدی سے گھٹا کر آٹھ فی صدی کر دی۔ پھر ۱۶۵۰ء میں چھ فی صدی
اس کے بعد ۵ فی صدی کی اور انجام کار ۱۸۵۴ء میں تعین شرح سود کا قانون
بالکل منسوخ کر دیا اور لوگوں کو سود کی داد و ستد میں بالکل آزاد کر دیا۔ اس
آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان میں شرح سود ایک زمانہ میں صرف دو فی
صدی سے تین فی صدی سالانہ تک گھٹ گئی۔ انگلستان صدیوں کے تجربہ
کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ سود پر سے تمام بندشیں اٹھا دینے سے روپیہ
آزادی کے ساتھ کاروبار میں لگ کر ملک کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ چنانچہ انگریزی
گورنمنٹ نے ہندوستان میں بھی ۱۸۵۵ء میں سود کو بالکل آزاد کر دیا۔

اس طرح سات سال کے عرصہ میں دو قانون پے در پے ایسے پاس ہوئے
جنھوں نے مسلمانوں کی حالت پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ ۱۸۴۹ء کے قانون کی
رو سے زمیندار اراضی کے مالک ہو گئے جس سے ان کی حیثیت اور دولت
بڑھ گئی۔ مگر مسلمان زمیندار کو حساب کتاب اور روپیہ رکھنے سے کبھی سابقہ
پڑا نہ تھا۔ اس قانون کے اجرا سے پہلے بھی اس کے غلہ کا حساب کتاب گاؤں
کا بنیہ جو مثل ایک ادنیٰ خادم کے ہوتا تھا، رکھتا تھا۔ اب غلہ کے بدلے جب
نقد مال گزاری ادا کرنے کی ضرورت ہوتی تو بنیہ سے روپیہ قرض لے کر ادا
کرتا جو رفتہ رفتہ بڑھتا رہتا۔ مگر ۱۸۵۶ء کے قانون نے جس کی رو سے شرح سود

غیر محدود ہوگئی قرضہ کی تعداد اور مقدار کو بھی غیر محدود کردیا۔

۵۔ سود کے قدیم اور جدید قوانین کا مقابلہ

اس سے قبل ہندوستان میں سود کا رواج ضرور تھا مگر بہت سی بندشوں کے ساتھ تھا۔ مثلاً زمانہ ہائے قدیم سے یہاں سود پر روپیہ دینے کی اجازت صرف ویشوں کو تھی اور وہ صرف اس قدر کہ اصلی رقم قرضہ سے سود کی رقم زیادہ نہ ہونے پائے! اس قانون کا نام دام دوپٹ تھا جو اب تک کلکتہ وصوبہ بمبئی اور برار میں جاری ہوا اور جس کی رو سے ہندؤں پر اصل رقم قرضہ سے سود کی رقم زیادہ نہ ہونے پائے۔ اس قانون کا نام دام دوپٹ تھا جو اب تک کلکتہ وصوبہ بمبئی اور برار میں جاری ہوا اور جس کی رو سے ہندؤں پر اصل رقم سے دوگنے سے زیادہ کی ڈگری نہیں ہوسکتی۔

مگر ۱۸۵۵ء کے قانون نے سود کی تمام بندشوں کو توڑ دیا۔ پہلے زمانہ میں قرضہ وصول کرنے کے لیے کوئی خاص قوانین نہ تھے اور نہ اس کے لیئے کوئی خاص چارہ کار تھا۔ قرضہ کی ادائیگی ایک اخلاقی فرض تھا اس لیئے قرضہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہتا تھا اور مدیون کی اولاد اپنی بساط کے موافق اس کے ادا کرنے کے لیئے تیار رہتی تھی۔ مگر قانون میعاد کے اجراء سے داین کے لیئے یہ ضروری ہوگیا کہ وہ چھ سال کے اندر اپنا قرضہ وصول کرلے ورنہ اس کا قرضہ مارا جاتا۔ یہ میعاد بعد میں صرف تین سال رہ گئی۔

اس کی وجہ سے عدالتوں میں نالشوں کی بھرمار ہونے لگی۔ اور اسی کی وجہ سے شرح سود بڑھی۔ سادہ سود کی جگہ سود در سود ہوگیا۔ ایک روپیہ سالانہ سود

کی جگہ دو تین روپیہ تک سود بڑھ گیا اور دیہات میں آدھ آنہ اور ایک آنہ فی روپیہ ماہوار کے حساب سے پچھتر فی صدی سالانہ تک پہونچ گیا۔ مدیون یہ کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح سے میعاد گذر جائے تاکہ وہ قرضہ کے بار سے بغیر اُسے ادا کیے ہوئے سبکدوش ہو جائے۔ غرض کہ ان وجوہ سے مقدمہ بازی کی بنیاد قایم ہوگئی۔ قرضہ کی علت میں منقولہ اور غیر منقولہ جائداد اور مویشی نیلام ہونے لگے اور مدیون گرفتار ہو کر جیل خانے جانے لگے۔

مسلمانوں کی قرضداری کے اعداد

ان وجوہ سے مسلمان زمینداروں کی بربادی کی کوئی حد و انتہا نہ رہی مثلاً مسٹر رابرٹسن نے راولپنڈی کی نسبت لکھا ہے کہ وہاں اسی فی صدی زمیندار مقروض تھے۔ یہ حالت دیکھ کر افسران ضلع کو خیال ہوا کہ یہ قرضداری صرف مسلمانوں کے مسرفانہ عادات کی وجہ سے ہے۔ اس لیے مسٹر ہیس نے ۱۸۹۶ء میں شمالی سندھ کے چند اضلاع میں تحقیقات کرائی جس کے نتائج حسب ذیل ہیں:۔

مسرف زمیندار	۱۵ فی صدی
باوجود محتاط ہونے کے مقروض	۷۵ فی صدی

اسی تحقیقات میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے قبضہ میں ۴۲ فی صدی اراضی بیع یا رہن ہو کر پہونچ چکی ہے۔ اسی طرح ۱۸۶۹ء میں ضلع مظفر گڑھ میں تحقیقات کرائی گئی جس سے معلوم ہوا کہ ۷۰ فی صدی مسلمان مقروض ہیں اور ہندو مسلمانوں کی نسبتی حالت حسب ذیل ہے۔

مسلمان	ہندو
(۱) مسلمان مُسرف اور غریب ہیں	(۱) ہندو کفایت شعار اور خوشحال ہیں
(۲) مسلمان جاہل ہیں۔	(۲) ہندو لکھے پڑھے اور تعلیم یافتہ ہیں
(۳) مسلمان جرائم کے عادی ہیں	(۳) ہندو پُرامن زندگی بسر کرتے ہیں
(۴) مسلمان صرف زراعت پیشہ ہیں	(۴) ہندو زراعت کے روپیہ کی دادوستد اور تجارت کرتے ہیں۔
(۵) مسلمان اراضی خریدنے کے لیے قرضہ لیتے ہیں۔	(۵) ہندو قرضہ کے بدلے اراضی حاصل کرتے ہیں۔

اکثر اصحاب سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جاتے رہنے اور اس کے بعد غدر کے واقعات نے مسلمانوں کو برباد کر دیا۔ مگر ہم دعوے کے ساتھ قوم کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کرنے کے لیے تیار ہوں کہ جس قانون کے اجراء نے بقول پنجاب کے مشہور مسٹر تھاربرن کے "دادوستد کرنے والی قوموں کو سونے کی کانوں تک پہونچا دیا" اسی نے مسلمانوں کو تھوڑے عرصہ میں فارغ البالی کی چوٹی سے گرا کر افلاس کے کھڈے میں گرا دیا۔ جو چیز ہندوؤں کے لیے رحمت ثابت ہوئی وہ مسلمانوں کے لیے سراپا زحمت ہی زحمت ہو گئی وہ اس طرح کہ زمین کو رہن اور بیع کرنے کے اختیارات حاصل ہونے سے تو بہ کثرت روپیہ قرض لیا گیا اور قرض لیا ہوا روپیہ شرح سود اور سود در سود کی آزادی سے اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھا جس کا پورا اندازہ آج تک بھی مسلمانوں کو نہیں ہوتا جب کہ وہ اپنی تمام جائدادیں قرضہ کی نظر کر چکے۔

۷۔ **سود کی مضرت سے بچنے کے قوانین**۔ اس حالت کو دیکھ کر بقول

مسٹر تھاربرن کے (جنھوں نے بعد میں پنجاب میں قانون انتقال آراضی پاس کرایا) حکام وقت کو یہ اندیشہ ہوا کہ بالعموم جملہ اقوام کے زمیندار اور بالخصوص مسلمان زمیندار ننگے بھوکے ہو کر ملک میں فساد اور بلوے کریں گے اس لیے انھوں نے ایسے قوانین تجویز کیے جن سے پرانی زمینداریاں قائم رہیں۔ اس کے لیے مختلف صوبوں میں مختلف قوانین جاری کیے گئے مثلاً ۱۸۷۶ء میں سندھ کی زیربار قرضہ جائدادوں کا قانون ۱۸۸۴ء میں کاشتکاروں کا قانون ۱۸۸۵ء میں ترقی حیثیت آراضی کا قانون ۱۹۰۱ء میں کاشتکاروں کی امداد کا قانون ۱۸۸۲ء میں جھانسی کی زیربار قرضہ جائدادوں کا قانون ۱۸۹۰ء میں کن کی رعایا کا قانون اور ۱۹۰۰ء میں پنجاب کا قانون انتقال آراضی پاس ہوا۔

۸۔ قانون انتقال اراضی

مندرجہ بالا قوانین کی تفصیلات کو طوالت کے اندیشہ سے ترک کر دیا گیا ہے۔ البتہ جس قدر قوانین پاس ہوئے اُن میں سب سے اہم پنجاب کا قانون انتقال اراضی تھا جو مسٹر تھاربرن کی رحم دلی اور غیر معمولی کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس قانون کی رو سے آراضی اُن ذاتوں کے حق میں منتقل ہونا بند ہو گئی جن کا پیشہ خالص ادستکاری تھا اور جو زراعت پیشہ نہ تھیں۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ زمینداروں کی جائداد بنیوں اور کھتریوں کے پاس رہن اور بیع ہونی بند ہو گئی اور ہزاروں خاندان بربادی اور تباہی سے بچ گئے۔ اس قانون کے پاس ہونے سے دس سال قبل کے دوران میں پنجاب کا قرضہ بقدر سولہ کروڑ کے بڑھ گیا تھا۔ مگر یہ قانون پاس ہونے کے دس سال کے اندر صرف

نوکر وڑ بھی بقدر نصف کے بڑھا جس سے اس صوبہ کو بدیہی نفع پہونچا۔

۹۔ قانون انجمن امداد باہمی

انتقال اراضی کا قانون نافذ ہونے کے تین سال بعد سر ڈینزل اببٹسن

Sir Danzil Ibbetsan.

کے زمانہ میں سنہ ۱۹۰۴ء میں ایک قانون انجمن ہائے امداد باہمی پاس ہوا اور اس سے ایک کی جگہ دو مفید قوانین ہو گئے جنھوں نے مل کر پنجاب کے زمیندار کاشتکاروں کی دولت میں خوب اضافہ کیا۔ خوش نصیبی سے اس محکمہ میں پنجاب کو ایسے ہمدرد افسر ملے جن کی نظیر دوسرے صوبوں میں کم ملے گی اور جن کی کوششوں سے دیہات میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک گئی اور بیس سال کے عرصہ میں کل ہندوستان کی چھبیس ہزار انجمنوں میں سے دس ہزار انجمنیں صرف پنجاب میں قایم ہو گئیں۔ گویا مردم شماری کے حساب سے جس قدر ہونی چاہیئے اس سے دوگنی انجمن ہائے امداد باہمی قایم ہوئیں۔

پھر یہ کہ پنجاب میں سود خواروں کی اس قدر کثرت ہے کہ الامان الحفیظ یعنی پنجاب کو چھوڑ کر تمام ہندوستان میں جتنے مہاجن ہیں اُن سے تین گونہ صرف پنجاب میں ہیں۔ یہاں دادوستد کے پیشہ کا اس قدر زور ہے کہ مہاجنوں کی آمدنی کا مقابلہ زندگی کا کوئی شعبہ نہیں کر سکتا۔ ان کی آمدنی نہ صرف تمام ملازمت پیشہ لوگوں سے زیادہ ہے بلکہ صنعت و حرفت کے کارخانوں کی آمدنی سے بھی دو چند ہے۔ ان کی سالانہ آمدنی کا تخمینہ

اُس ٹیکس کے حساب سے جو وہ ادا کرتے ہیں چھ کروڑ سالانہ کیا جاتا ہے
مگر پنجاب کے زمیندار کاشتکاروں نے کچھ تو ذاتی دادوستد سے اور
کچھ قانون انتقال آراضی اور انجمن ہائے امداد باہمی کی مدد سے مہاجنوں
کا مقابلہ نہایت کامیابی سے کیا اور گزشتہ دس سال میں ان کی تعداد تقریباً
دس فی صدی کے گھٹا دی اور مسٹر ڈارلنگ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ
جالندھر میں سکھ جاٹ اس ضلع کے ساہوکاروں کو بے دخل کر رہے ہیں اور
امرت سر، لدھیانہ اور ہوشیارپور کے ساہوکاروں کا برابر مقابلہ
کر رہے ہیں۔ مسٹر ڈارلنگ نے یہ بھی لکھا ہے کہ لائل پور کے سکھ کاشتکار
جنوبی یورپ کے کاشتکاروں سے زیادہ خوش حال ہیں۔

۱۰۔ مفید ترین قوانین سے مسلمانوں نے نفع نہیں اٹھایا

مگر اب سوال یہ ہے کہ ان تمام مفید ترین حالات اور بہترین قوانین کی موجودگی میں جو بیس پچیس سال سے پنجاب میں جاری ہیں مسلمانوں نے کیا نفع اُٹھایا؟ اس سوال کے جواب میں اخبارات کے کالم اور سرکاری رپورٹیں مسلمانوں کی نوحہ خوانی سے پُر نظر آتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک اخبار میں لکھا تھا کہ لودھیانہ اور ہوشیارپور کے مسلمان زمینداروں کے قرضوں کا اوسط اُن کے سرکاری مالیہ سے ۲۰ گونہ ہے۔ دوسری جگہ لکھا تھا کہ مسلمانوں پر ساٹھ کروڑ قرضہ ہے۔ ایک تیسرے اخبار میں لکھا تھا کہ پنجاب میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کسی قدر کم ہے مگر ٹیکس دہندگان میں مسلمانوں سے تیرہ گونہ ہے اور خود میں نے مردم شماری کی رپورٹ میں دیکھا کہ ہندو

جو رقم انکم ٹیکس میں دیتے ہیں وہ مسلمانوں کی مجموعی رقم سے ۲۰ گونہ ہے۔ مسٹر ڈارلنگ نے مظفر گڈھ کے بلوچیوں کی نسبت لکھا ہے کہ "ان کی ننانوے فی صدی یعنی تمام آراضی ہندوؤں کے پاس رہن ہو گئی جو اس کی کل پیداوار پر قابض ہیں اور نام نہاد مالکان آراضی سے غلاموں کے سے کام لیتے ہیں اُن سے مشقت کراتے ہیں اور مویشی اور پانی کی چوری کراتے ہیں"۔

مسٹر ڈارلنگ موصوف نے مسلمانوں کی قابل رحم حالت سے متاثر ہو کر لکھا ہے کہ

"قرضہ کے گراں بار میں دب کر کوئی شخص یہ اُمید نہیں کر سکتا کہ اُس کے قوی کا نشوونما ہوگا۔ اور یہ کلیہ اگر افراد کے لیئے درست ہے تو جماعتوں کے لیئے بھی ضرور درست ہونا چاہیئے پس جب تک کہ مسلمان قرضہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں وہ اپنی حالت کسی طرح بہتر نہیں کر سکتے۔ اور بدترین امر یہ ہے کہ یہ قرضہ ہندوؤں اور سکھوں کا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات میں کشیدگی ہے اور رنجش کی موجودگی صوبہ کی پوری ترقی اور نشوونما کے لیئے مضر ہے۔ کیونکہ جس خاندان میں اندرونی نزاع ہو اس کا قایم رہنا مشکل ہوتا ہے"

مسلم زمینداروں نے بنیوں کی جگہ لے لی

تمام ہندوستان کے مسلمان، پنجاب کے مسلمانوں کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ ان کی جائدادیں قانون انتقال آراضی کی وجہ سے محفوظ ہیں مگر

جب کسی جماعت میں قانون سے فائدہ اُٹھانے کی اہلیت نہ ہو تو قانون زبردستی کہاں تک فائدہ پہونچا سکتا ہے۔ موجودہ قوانین کی رو سے زراعت پیشہ ذاتوں کی جائدادیں۔ غیر زراعت پیشہ ذاتوں کے نام منتقل نہیں ہوسکتیں مگر جب مسلمانوں کو قرضہ لینے اور جائداد رہن و بیع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اوّل تو فریقین سیکڑوں صورتیں بیع و رہن کی نکال سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب سے مہاجن کے لیئے مزروعہ آراضی کو اپنے حق میں رہن و بیع کرانے کا دروازہ بند ہوا ہے مہاجنوں کی جگہ غیر مسلم زمینداروں اور کاشتکاروں نے روپیہ کی دادستد کا کام اختیار کر لیا اور اب وہ لوگ قانون کی رو سے اسی طرح مسلمانوں کی جائدادیں حاصل کر رہے ہیں جس طرح سے کہ مہاجن اور کھتری حاصل کیا کرتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے بعض ضلاع سے سود خوار مہاجن کو خارج کر کے اس کی جگہ لے لی ہے۔ ان کی نسبت ایک زمیندار نے مسٹر ڈارلنگ سے یہ لطیفہ کہا تھا کہ "اگر قانون انتقال آراضی نے بھیڑ کو بھیڑیئے کے پنجوں سے چھڑایا تھا تو صرف اس لیئے کہ اُسے قصاب کے سپرد کر دے"

گویا کہ مسلمان زمینداروں کی قسمت میں تو بربادی لکھی ہے خواہ وہ بنیہ اور کھتری کے ہاتھوں سے ہو یا سکھ اور جاٹ کاشتکاروں کے ہاتھوں سے۔

۱۲۔ قانون انتقال آراضی کی منسوخی کا مسئلہ

ایک اور اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس قسم کے قوانین جیسا کہ قانون انتقال آراضی ہے محض عارضی حالات کی بنا پر عارضی فوائد کے لیئے جاری ہوا کرتے ہیں۔ جیسا کہ کورٹ آف وارڈس کا قانون نابالغوں کے لیئے ہے

جب نابالغی کا زمانہ گزر جاتا ہے تو پھر اس قانون کا نفاذ اس پر سے اٹھا لیا جاتا ہے چنانچہ مسٹر تھاربرن نے قانون انتقال اراضی کی ضرورت ثابت کرنے کے لیئے مسلمانوں کی نسبت کہا تھا کہ

"عقل معاش کے اعتبار سے وہ مثل ایک دشتی زنبے کے ہیں"

گویا مسلمانوں میں عقل معاش پیدا کرنے کے لیئے یہ قانون پچیس[۲۵] سال سے نافذ ہے مگر کچھ لوگ اس قانون کو عرصہ تک جاری رکھنا ملک کے لیے مضر سمجھتے ہیں اور اس کے کچھ نقصانات بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ جو قانون کسی جماعت کی حفاظت کے لیئے نافذ کیا جاتا ہے اگر وہ عرصہ تک قایم رہے تو اس جماعت کو کمزور کر دیتا ہے جیسے کسی بچہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے چلاتے رہیں تو وہ چلنا نہیں سیکھتا اور کمزور رہ جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زمینداری اور کاشتکاری کی ترقی اس وقت زیادہ ہو سکتی ہے جب کہ اس پیشہ میں ذی فہم اور تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوں۔ یہ لوگ بالعموم شہروں میں رہتے ہیں اور موجودہ قانون کی وجہ سے زمینداریاں نہیں خرید سکتے اگر انھیں خریداری کی اجازت ہو تو وہ کاشت کے کاموں میں اپنا سرمایہ اور دماغ صرف کریں اور تب ملک کو خوب ترقی ہو۔ غرض کہ اس قسم کی چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور خود مسٹر ڈارلنگ نے اپنی کتاب میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ "اب وہ وقت آگیا کہ قانون انتقال اراضی میں ترمیم کردی جائے۔"

اگر خدانخواستہ یہ قانون منسوخ یا ترمیم ہو گیا تو خطرہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا

جو ایک خیالی سہارا تھا وہ بھی باقی نہ رہے گا" خالی سہارے" کا لفظ اس لیے عرض کیا گیا ہے کہ جو مختلف قوانین کمزور جماعتوں کے لیے مختلف اوقات میں نافذ ہوئے اگر وہ مرض کے صحیح علاج ہوتے تو وہ ضرور مسلمانوں کو مستقل نفع پہنچاتے مگر یہاں تو ہنوز روز اول کا مضمون صادق آتا ہے۔

اس موقعہ پر میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو اصحاب مسلمانوں کی بربادی روکنے کے لیے مختلف اوقات میں کوشاں ہیں قانونی مسودات پیش کرتے رہتے ہیں وہ نہایت شکرگزاری کے مستحق ہیں اور قوم کو ان کی ہر طرح امداد و ہمت افزائی کرنی چاہیے مگر تمام قوم کا قانونی ترمیمات کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا بڑی پست ہمتی کی علامت ہے بالخصوص مسلمانوں کے لیے جو ایسا جری اور بہادر قوم رہی ہے یہ کتنی ہوئی بات ہے کہ ان کا بہر کا وقت خاص مراعات خاص قوانین اور حفاظتی قواعد کی جستجو میں ہو گیا ہے جیسا کہ عرض کیا گیا حفاظتی قوانین قوم کو کمزور کرنے والے ہوتے ہیں ہمیں اپنے آپ کو اس قابل بنانا چاہیے کہ جس طرح ہیرو تبرزینہ و تلوار و تیر و تفنگ کی لڑائیوں میں ہم کھلے میدانوں میں لڑ کر کامیاب ہوئے آج کل اسی سرمایہ داری اور روپیہ کے کاروبار میں بغیر قانونی آڑ اور امداد کے کیوں نہ فتح حاصل کریں۔

<table>
<tr>
<td>یقینی امر ہے کہ پنجاب نے گزشتہ پچیس سال میں بہت دولت پیدا کی جس میں مسلمانوں کی محنت کا بھی بڑا حصہ ہے۔ بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ</td>
<td>باوجود قانون انتقال اراضی کے قرضہ میں زیادتی</td>
</tr>
</table>

محنت کرنے میں وہ دیگر اقوام سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہیں مگر بقول مسٹر تھاربرن کے۔

"مسلمان اس لیے محنت کرتے ہیں کہ دوسرے لوگ اس سے آرام پائیں اور اس لیے بوتے ہیں کہ دوسرے لوگ اسے کاٹیں۔ اُمید انھیں چھوڑ دیتی ہے اور مایوسی اُن پر مسلّط ہو جاتی ہے۔ اور آزاد انسانوں کی خوبیوں کی جگہ اُن میں غلاموں کے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔"

اگر مسٹر تھاربرن کے یہ الفاظ نقل کرنے کسی صاحب کو ناگوار ہوں تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ میری غرض صرف یہ ہے کہ مسلمان محنت میں دوسروں سے کم نہیں۔ مگر اس سود ہی کی وجہ جو قانون انتقال اراضی پاس ہو جانے کے ایک حد تک مسلمانوں کی وجہ سے کل سود کا قرضہ بڑھ گیا ہے اور شرح سود بھی نہیں گھٹی۔

پہلے عرض کیا گیا ہے کہ قانون انتقال اراضی نافذ ہونے میں پنجاب کا مجموعی قرضہ گھٹ گیا تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد جب یہ زراعت پیشہ اقوام نے روپیہ کا لین دین شروع کر دیا اور اُن کے پاس مسلمانوں نے اپنی زمینداریاں گفول اور رہن کرنی شروع کر دیں تو پھر ملک کا قرضہ بڑھ گیا جیسا کہ حسب ذیل اعداد سے واضح ہوگا۔

سنہ ۱۸۹۳ سے ۱۹۰۲ء تک	یعنی قانون انتقال اراضی نافذ ہونے سے قبل	قرضہ بقدر ۱۶ کروڑ بڑھا
سنہ ۱۹۰۳ سے ۱۹۱۱ء تک	قانون مذکور نافذ ہونے کے فوراً بعد	قرضہ بقدر ۹ کروڑ بڑھا

۱۹۱۳ سے ۱۹۲۲ تک	یعنی گزشتہ دس سال میں جب سے زراعت پیشہ لوگ زیادہ داد و ستد کرنے لگے	قرضہ بمقدار ۳۰ کروڑ کے بڑھا

ملکوں کا قرضہ بڑھنے سے ہمیشہ یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس سے انھیں نقصان ہی نقصان رہتا ہے۔ اگر روپیہ قرض لے کر ملک کی ترقی میں اور نفع آور کاموں میں لگایا جاتا ہے تو باوجود قرضہ بڑھنے کے وہ ملک کے لیئے مفید ہوتا ہے مگر پنجاب میں جو مقدار قرضہ کی بڑھی ہے اس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے ہاتھوں بیجا عیش پرستی اور غیر نفع آور کاموں میں لگا ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ صوبہ کے قرضہ کی مقدار ہے۔ صوبہ کی پیداوار اگرچہ خوب رہی ہے جس سے روپیہ زیادہ آتا ہے مگر اسی کے ساتھ معاشرت بھی بڑھ رہی ہے اور جو لوگ روپیہ کا کچھ اور مصرف نہیں جانتے وہ لامحالہ عیش اور آرام اور لطف کی چیزوں پر روپیہ صرف کرتے ہیں۔

۴۔ مسلمانوں کے اسراف کی وجہ مگر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ روپیہ کو عیش پرستی میں صرف کرنے میں مسلمان ہی سب سے آگے کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان اب تک صرف دولت سے واقف ہیں اور سرمایہ سے واقف نہیں جس روز وہ سرمایہ سے واقف ہو جائیں گے تو وہ بھی مثل دیگر اقوام کے محتاط کفایت شعار اور عاقبت اندیش ہو جائیں گے۔ مذہبی کتابوں میں جس قدر برائیاں دولت کی لکھی ہیں ان کا ایک ایک لفظ درست ہے کیونکہ دولت اس روپیہ سے مراد ہے جو کسی کام میں

نہ لگا ہو اس حالت میں یا تو اسے جلد سے جلد صرف کرکے اس سے لطف اُٹھایا جائے یا کسی آئندہ زمانہ میں اس سے لطف اُٹھانے کے لیئے اسے مکان میں یا زمین کے نیچے محفوظ کر دیا جائے۔ اگر اُسے فوراً صرف کرکے لطف اُٹھایا جاتا ہے تو یہ اسراف ہے جس پر مسلمانوں کا عمل ہے اور جس کے لیئے کلام پاک میں "تبذیر" کا لفظ آیا ہے اور مبذرین کو "اخوان الشیاطین" قرار دیا گیا ہے۔

برخلاف اس کے تکلیف اُٹھا کر اگر روپیہ کو زیر زمین پہنچا دیا جائے اور اس طرح اُسے بیکار رکھا جائے اور ملک اور قوم کی ترقی اور نیک کاموں میں صرف ہونے سے روکا جائے تو یہ بخل ہے اور اس طریقہ پر روپیہ رکھنے والوں کے لیئے کلام پاک میں آیا ہے۔ "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ط كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ط نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ إِنَّهَا عَلَيْهِم مُّؤْصَدَةٌ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ"

اس سے معلوم ہوا کہ اسراف اور بخل دونوں چیزیں مذموم اور مخرب اخلاق ہیں اور یہ دونوں فی الواقع دولت کے نتیجے ہیں نہ کہ سرمایہ کے۔ اور خود مجھے اقتصادی حالت کی ترقی کی تحریک کی نسبت اندیشہ رہتا ہے کہ مسلمان اس سے غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو کہیں سے دس ارب روپیہ بھی مل جائے تو ان کی حالت اب سے بدتر ہو جائیگی کیوں کہ وہ اور زیادہ مسرف اور عیش پرست ہو جائینگے اس افلاس میں بھی ان کی یہ حالت ہے کہ بڑے شہروں میں جن میں مزدوروں کو اچھی مزدوری

ملتی ہو وہاں وہ اپنی کمائی شراب خواری اور عیاشی میں صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح
جن علاقوں میں زیادہ پیداوار کی وجہ سے مسلمانوں کے پاس زیادہ روپیہ
آتا ہے وہاں بھی وہ اُسے ضایع کر دیتے ہیں۔

۱۵۔ سرمایہ کیا ہے؟ بہر حال جس چیز کے متعلق میں اصرار کرتا ہوں وہ
دولت سے مختلف ہے اور وہ "سرمایہ" ہے۔ سرمایہ
وہ روپیہ نہیں جو اپنی جیب میں رکھا ہو یا مکان میں دفن ہو بلکہ صرف وہ
روپیہ ہے جو کام کرنے والے مزدوروں کے کھانے اور کپڑے میں صرف ہو، جو
آلاتِ زراعت میں کارخانوں، ریلوں اور نہروں میں لگا ہوا اور جس سے
ملک کی حقیقی ترقی متصور ہو۔ جب انسان کو ان کاموں میں روپیہ لگانے
میں ذائقہ آنے لگتا ہے تو پھر اُسے اپنی ذات پر بجز قوتِ لا یموت کے ایک پیسہ
بھی صرف کرنا گراں گزرتا ہے۔ خود اپنے اس صوبہ کو دیکھ لیجیے کہ جن اضلاع میں
سے نہروں کا گزر ہوا وہاں کے ہندو مسلمان، دونوں پر دولت برسنے لگی
مگر اس دولت کے ساتھ دونوں نے کیا برتاؤ کیا؟ ہندوؤں نے تو اس دولت
کو سمیٹ کر اس کا ایک ایک پیسہ نفع آور کاموں اور روپیہ کے کاروبار
میں لگا کر اُسے سرمایہ میں منتقل کر لیا جس سے اُن کی آمدنی بڑھنے کا ایک
مستقل سلسلہ قائم ہو گیا۔ برخلاف اس کے مسلمانوں نے نہ صرف اپنی کمائی
ہوئی دولت کو صرف کر ڈالا بلکہ ہندوؤں کا بھی روپیہ اُن سے قرض لے کر
غیر نفع آور کاموں، اسراف اور عیش پرستی میں لگا یا اور مفلس تر اور تنگ دست
ہو گئے۔

میرے پاس اتفاق سے اسی ہفتہ میں ایک مسلمان پٹواری کا خط ضلع منٹگمری سے آیا ہے جس سے میرے اس خیال کی پوری تصدیق ہوتی ہے اس خط کا اقتباس یہ ہے۔

"اس ضلع کے مسلمانوں کی حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوں کہ تھوڑی سی رقموں سے اُن کے نام چند سال سے کس قدر قرض ہو گیا۔ دوکان اران حکایت ذرا سی دوکان کے مالک ہوتے ہیں مگر بڑی بڑی آراضیات والے اُن کے سامنے ہیچ ہیں۔ وہ فصل کی ساری جنس بھی لے لیتے ہیں۔ مگر قرض عمر کا توں رہتا ہے۔ اس میں کمی کی اُمید مشکل ہے کیونکہ یہ سب کچھ سود کا نتیجہ ہے زمینداران آدھی گویا دوکانداروں کے مفت کے مزارعہ ہیں۔ ایسی صورت میں مسلمان کسی طرح ترقی کا منہ نہیں دیکھ سکتے"

حضرات!

میں تفصیل کے ساتھ عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اختصار کے ساتھ اُسے دُہراتا ہوں کہ جو بے نظیر مواقع مسلمانوں کو پنجاب میں حاصل ہیں وہ ہندوستان کے کسی دوسرے صوبہ میں نہیں ہیں۔ یہاں خدا کے فضل سے مسلمانوں کی مردم شماری زیادہ ہے اسی کے ساتھ زمینداروں اور کاشتکاروں میں ان کی تعداد زیادہ ہے جسمانی اعتبار سے یہاں کے مسلمان قوی ہیں۔ کاشتکاری کی اغراض کے لیئے یہاں کی زمین دُنیا میں اوّل درجہ کی سمجھی جاتی ہے۔ ایک ثلث رقبہ نہروں سے سیراب ہے۔ آبادی کی نسبت سے زمین زیادہ ہے اس لیئے کاشت کی وسعت و ترقی کے لیئے میدان کشادہ ہے۔ انتقال اراضی کا

قانون جو مخصوص طور پر مسلمانوں کے لیئے مفید ہی یہاں نافذ ہی اب سب سے بڑھ کر یہ کہ انجمن ہائے امداد باہمی کا بہترین نظام یہاں موجود ہی جو خاص کر مسلمانوں کے لیئے خدا کی رحمت ہی۔ مجھے یہ امر ظاہر کرنے میں نہایت خوشی ہی کہ پنجاب کے مسلمان اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور مجھے اُمید ہی کہ اس سے اور زیادہ نفع اُٹھائیں گے مگر باوجود بہترین مواقع کے جب پنجاب کی نسبت بھی یہ سننے میں آتا ہی کہ یہاں کے مسلمان بھی افلاس سے پریشان ہیں تو جگہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کے دلوں پر مایوسی طاری ہو جاتی ہی۔ بس پنجاب کو مسلمانوں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کے لیئے اپنی مالی حالت کو درست کرنا چاہیئے اور افلاس و گداگری کے دھبہ کو اپنے دامن سے دھوڈالنا چاہیئے۔

آخر میں میں اپنے تعلیم یافتہ بزرگوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کے اقتصادی مسئلہ کی طرف خاص طور پر توجہ فرمائیں اور اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ ان سرکاری رپورٹوں اور کتابوں کے مطالعہ میں صرف کریں جن سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ ہو۔ خود میری حالت تو اس جاہل شخص کی مانند ہی جو کسی ایسے مقام پر جا پہونچا ہو کہ جہاں اس کے بھائی ذبح ہو رہے ہوں۔ اور انہیں ذبح ہوتا دیکھ کر وہ شخص اپنے گھر آکر لوگوں سے اپنے بھائیوں کے ذبح ہونے کے حالات بیان کرتا ہی مگر چونکہ اس میں طاقت لسانی نہیں۔ اظہار مطلب کی قابلیت نہیں جوش بیانی نہیں اس لیئے اس کے کہنے کا اثر بہت کم ہوتا ہی پس میں چاہتا ہوں کہ جس

منظر کا میں نے مشاہدہ کیا ہے اور جن رپورٹوں کی جھلک میں نے دیکھ لی ہے اُن کا مطالعہ ذی فہم اور تعلیم یافتہ اصحاب کرکے قومی بربادی اور اس کے اسباب کا صحیح طور پر پتہ لگا ئیں۔

دُنیا میں قومیں حاکم بھی رہی ہیں اور محکوم بھی۔ ہندوستان کی پرانی قومیں ہزاروں برس غلامی میں رہی ہیں اور شدید ترین مصائب انھوں نے جھیلے ہیں مگر کبھی کوئی قوم افلاس وگداگری کے اس درجہ تک نہیں پہونچی جیسی کہ مسلمانوں کی قوم پہونچی ہوئی ہے بلکہ بدقسمتی سے مسلمانوں کی خصوصیت اب یہ ہوگئی ہے کہ وہ حاکم ہوں یا محکوم، آزاد ہوں یا غلام، سب جگہ یکساں طور پر مفلس و نادار ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ بھائیوں میں سے بعض صحاب اہم تاریخی مسائل کی تحقیقات کرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے کام کرتے ہیں۔ اُن کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ اُن میں سے ایک دو اصحاب مسلمانوں کے افلاس وگداگری کے اسباب تلاش کرنے میں اپنا وقت صرف کریں۔ سب سے اوّل اپنے ضلع کے گزیٹر پڑھیں مردم شماری کی رپورٹیں پڑھیں پچھلے جملہ بندوبستوں کی رپورٹیں پڑھیں اور دیکھیں کہ ہر بندوبست میں مسلمانوں کی کس قدر جائدادیں بتدریج کم ہوتی گئی ہیں اور اُن کے اسباب کیا ہیں۔ ہر سال دو سال بعد مختلف قسم کے کمیشن ملک میں بیٹھتے رہتے ہیں اُن کی ضخیم رپورٹیں پڑھنا ایک شخص کا کام نہیں ہے ان کا مطالعہ یہ معلوم کرنے کے لیے کریں کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت میں کیا کیا اور کن کن وجوہ سے کمی یا بیشی ہوئی۔ غرض کہ یہ مضمون نہایت وسیع ہے۔ اور جس طرح مسٹر گوکھلے نے

ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیئے سروینٹ آف انڈیا سوسائٹی قایم کر کے پولیٹکل امور کے متعلق ایک کتب خانہ جمع کر دیا اور نوجوانوں کو وظائف دے کر پولیٹکل ریسرچ کا کام کرایا۔ اسی طرح مسلمان اس قسم کا کوئی انتظام کریں جس سے اُن کا اقتصادی مسئلہ حل ہو۔

کسی فرد یا قوم کی بدبختی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ اُس کے دل میں کسی چیز کا ولولہ ہو مگر اس کے حصول کے لئے اُسے صحیح ذرائع معلوم نہ ہوں۔ مسلمانان ہند کے دلوں میں مدت دراز سے نہ صرف اپنے ملک کو آزاد کر لینے کی بلکہ تمام اسلامی ممالک اور مقامات مقدسہ کو غیر مسلموں کے اثر سے پاک کرنے کی تمنا ہے اور اس کے لیئے جان توڑ کوشش کرتے ہیں۔ اس تمنا کو پورا کرنے کے لیئے کبھی ایک قوم سے اتحاد و دوستی کرنے کو ذریعہ حصول مقصد قرار دیا جاتا ہے اور کبھی دوسری قوم سے جب اس میں ناکامی ہوتی ہے تو اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ اور جس سے دوستی ہوئی تھی اُس سے نفرت کی جاتی ہے اور جس سے نفرت تھی اُس سے دوستی کی تدابیر سوچی جاتی ہیں۔ جو قومی کمزوری کی خاص علامت ہے۔ اور اس دوران میں حصول سلطنت اور حصول آزادی تو در کنار صحرائی اور بکنی جائدادیں مکفول اور رہن ہو ہو کر فروخت ہوتی جاتی ہیں۔ اور مستقبل قریب میں تو کیا مستقبل بعید میں بھی اس امر کی اُمید باقی نہیں رہتی کہ دوسری کوئی قوم مسلمانوں کو دوستی یا دشمنی کے قابل بھی سمجھے گی پس مسلمانوں کو زیادہ اونچی باتیں چھوڑ کر سب سے مقدم اپنے گھروں کی خبر لینی چاہیئے اور اپنے حسب حال مناسب تدابیر اختیار کرنی چاہیئیں۔ مثلاً یہ کہ سب سے اول

انجمنہائے امداد باہمی کی تحریک سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھایا جائے۔ اور ہر زمیندار کوشش کرے کہ کم سے کم بقدر ایک سال کی مالگذاری کے اُس کا اثاثہ مستقل سرمایہ کی شکل میں کسی بینک میں جمع ہو جائے۔ پنجاب کے جن اضلاع میں مسلمانوں کی زیادتی ہے ان میں ہر مقروض زمیندار کا قرضہ اوسطاً بقدر بیس یا پچیس سال کی مالگذاری کے ہے۔ برخلاف اس کے خوشحال اضلاع میں بقدر چار یا پانچ سال کی مالگذاری کے ہے۔ پس مسلمان زمینداروں میں سے ہر شخص اگر یہ کوشش کرے گا کہ بقدر اس کی ایک سال کی مالگذاری کے اُس کا سرمایہ محفوظ ہو تو مصیبت اور خشک سالی کے زمانے میں وہ اثاثہ کام آئے گا۔ خان بہادر سید جعفر حسین صاحب چند ماہ سے ضلع میرٹھ کے دیہات میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر زمینداروں کا بینک قائم کر رہے ہیں۔

جن مقامات میں انجمنہائے امداد باہمی کی تحریک نہیں پہونچی وہاں مسلمانوں کو اپنی ذاتی اور قومی حفاظت کے لیے مثل دیگر اقوام کے روپیہ کا کاروبار کرنا چاہیئے اور اپنے بھائیوں کو معیّن منافعہ پر قرض دے کر انھیں تجارت و صنعت میں مدد دینی چاہیئے۔ آپ صاحبوں نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ پچھلے دنوں بیرونی سرمایہ کو روکنے کے لیئے ایک کمیٹی قایم ہوئی تھی۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ مشورہ دیا ہے کہ ہندوستانیوں کو بینک کے کاروبار کی باقاعدہ تعلیم دیجائے بینکوں کے متعلق ایک آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ قایم کیا جائے۔ ہندوستان میں جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہو اُسے اندرون ملک کے روپیہ سے پورا کیا جائے۔

ہندوستان میں طرز جدید کی مالی منڈیاں قائم کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کا جدید سیلاب عنقریب آنے والا ہے جس کے لئے اگر مسلمانوں نے خاص تیاری نہ کی تو پوری قوم اس میں بہہ کر برباد ہو جائے گی پس اس کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو خاص طور پر تیاری کرنی چاہیئے اور بچوں سے لیکر بوڑھوں تک سب کو کسی نہ کسی شکل میں روپیہ کے کاروبار سے عملی واقفیت حاصل کرنی چاہیئے اور سردست اسی کو اپنا نصب العین قرار دے کر اپنی قوم کو سرمایہ داروں کی غلامی سے آزادی دلانی چاہیئے۔ فروری ۱۹۲۶ء

---

(۳۰)

غیر ملکوں کا سرمایہ اور مسلمان

کمیٹی تحقیقات بیرونی سرمایہ کی سفارشات

کچھ عرصہ سے اخبارات میں بیرونی سرمایہ کے متعلق تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پر اظہار رائے ہو رہا ہے اور اس میں مسلم اخبارات کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ رپورٹ مذکور میں بیرونی سرمایہ کی چند قسمیں قرار دے کر ان پر بحث

کی گئی ہے اور یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں کو بینک کے کاروبار کی باقاعدہ تعلیم دی جائے۔ بینکوں کے متعلق ایک آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ قایم کیا جائے ہندوستان میں جس قدر نئے سرمایہ کی ضرورت ہو اُسے اندرونی سرمایہ سے پورا کیا جائے۔ ہندوستان میں طرز جدید کی مالی منڈیاں قایم کی جائیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب تجاویز نہایت عمدہ اور مفید ہیں بشرطیکہ ہندوستان کی جملہ اقوام اُن کے عملدرآمد میں حصہ لے سکیں۔

۲۔ ترقی کی منزلیں

واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں اپنا سرمایہ نہ ہو یا اگر کچھ سرمایہ ہو اور وہ نفع آور کاموں کی جگہ غیر نفع آور کاموں میں لگتا ہو تو ملک کا اس میں نفع ہے کہ اُس میں بیرونی سرمایہ بھی آئے تاکہ اُس سے مختلف قسم کے کام جاری رہیں اور اُن میں غربا کو کام ملے۔ جو ممالک پسماندہ اور غریب ہیں اُن کی ترقی کی پہلی منزل یہی ہے کہ ریلوں، نہروں اور کارخانوں میں سرمایہ لگے خواہ وہ بیرونی ہو یا اندرونی چنانچہ ایک صدی سے زیادہ سے اہل یورپ کا اربوں روپیہ ہندوستان میں نفع آور کاموں میں لگا ہوا ہے جس کی بدولت لاکھوں غربا کو کام مل رہا ہے اور اُس سے خود اُن کی اور بچوں کی زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں۔ اگرچہ اسی کے ساتھ وہ لوگ سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ترقی کی دوسری منزل یہ ہوتی ہے کہ مزدوروں کو سرمایہ داروں کی غلامی سے نکالا جائے۔ اس کے لیے مختلف ممالک میں مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بیرونی سرمایہ کو اپنے ملک میں آنے سے

قطعاً روک دیا جائے جیسا کہ بالشویک تحریک کی ابتدا میں روس میں کیا گیا
مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں مزدور بیکار ہو کر بھوکے مرنے لگے اور تمام ملک
تباہی کے کنارہ آ لگا تھی کہ انہیں بالآخر غیر ممالک کے سرمایہ داروں سے
رجوع کرنا پڑا اور ان کی امداد اور دستگیری سے پھر مزدوروں کو کام
ملنا شروع ہوا۔ اس کے اس تجربہ سے واضح ہو گیا کہ بیرونی سرمایہ
محض روپیہ کی آمد روکنے سے ہرگز نہیں رک سکتا اور رک بھی جائے تو
خود اسی ملک کے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ جب
ہندوستان میں ترقی کے کاموں کے لیے سلطنت کی طرف سے روپیہ
قرض لیا جاتا ہے تو باوجود چھ فی صدی اور پانچ فی صدی شرح سود دینے
کے کروڑوں روپیہ کے تمسکات انگلستان کے لوگ چند گھنٹوں میں
خرید لیتے ہیں اور ہندوستان والے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور شکایت
کرتے ہیں کہ ہم کو سرکاری تمسکات خریدنے کا پورا موقع نہیں دیا گیا
مگر اصلیت یہ ہے کہ جب کہ ہندوستان کے مہاجنوں کو مسرف اور ناعاقبت
اندیش مسلمانوں سے بارہ فی صدی سے چوبیس فی صدی سالانہ تک سود
کیا ملتا ہے بلکہ روپیہ سے دس گونی قیمت کی جائدادیں آسانی سے مل جاتی
ہیں تو انھیں کیا ضرورت ہے کہ وہ چھ فی صدی سالانہ منافعہ کے سرکاری
تمسکات خرید کر اپنے روپیہ کو پھنسانا پسند کریں یا جدید قسم کے کارخانے
بنا کر ان میں اپنے روپیہ کو خطرہ میں ڈالیں یہی وجہ ہے کہ باوجود سے کہ
ہندوستان میں روپیہ کی دادوستد کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے

تاہم ملک کی صنعت و حرفت میں اُن کا بہت کم روپیہ لگتا ہے اور جو کچھ لگتا ہے وہ غریب کاریگروں کو نہایت گراں سود پر دیا جاتا ہے جس سے وہ تمام العمر سسکتے رہتے ہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ جب تک ہندوستان کے اندرونی روپیہ کی شرح سود نہ گھٹے تب تک بیرونی سرمایہ کا ہندوستان میں داخل ہونا نہ نقصان دہ ہے اور نہ وہ کسی کے روکے رک سکتا ہے۔

۳۔ ہندوستان میں شرح سود نہ گھٹنے کی وجہ

پس ہندوستان میں شرح سود نہ گھٹنے کی وجہ

یہی ہے کہ مسلمانوں کی سات کروڑ قوم ہر وقت سودی قرضہ لینے کی خواہشمند رہتی ہے اور قرض لے کر زیادہ تر اُسے غیر نفع آور کاموں اور ذاتی آسایش نمائش کے کاموں میں صرف کر ڈالتی ہے۔ گویا مہاجنوں کا وہ روپیہ جو ملک کی ترقی کے کاموں میں لگتا وہ زیادہ تر مسلمانوں کی وساطت سے غیر نفع آور کاموں میں صرف ہوتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔ پس جو اصحاب ملک کی صنعتی، اقتصادی اور حقیقی ترقی چاہتے ہیں وہ خواہ کسی قوم سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں اُن کا سب سے پہلا یہ کام ہونا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کو یہ سکھائیں کہ اُن کے افراد اپنی آمدنی کا ایک حصہ پس انداز کر کے کسی نفع آور کام میں لگائیں۔ مسلمانوں کے اس عمل سے نہ صرف یہ کہ خود اُن کا اور ان کی قوم کا نفع ہوگا

بلکہ

دیگر اقوام کا روپیہ بھی ملک کی بہبودی کے کاموں میں لگ کر اس کی ترقی کا موجب ہوگا اور بازاروں میں روپیہ کی افزائش سے عام شرح سود اس قدر

گھٹ جائے گی کہ غیر ملک کے سرمایہ داروں کو اپنا روپیہ ہندوستان میں لگانے میں زیادہ نفع نہ رہے گا اور وہ وقت حقیقی معنوں میں بیرونی سرمایہ کے رک جانے کا ہوگا۔

۴۔ سرمایہ کے لیے بڑا میدان ہے

مگر موجودہ حالت میں تو اندرونی اور بیرونی دونوں سرمایوں کے لیے ہندوستان میں بڑی گنجائش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہر قسم کی تجارت و صنعت اور کاروبار کا انحصار بنکوں کے وجود پر ہے۔ انہیں میں افراد کے روپیہ قطرہ قطرہ جمع ہو کر دولت کا سمندر بن جاتا ہے اور ان افراد کو کفایت شعاری سکھاتا ہے اور انہیں بنکوں کے ذریعہ روپیہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بآسانی منتقل ہوتا ہے اور بنکوں ہی کے ذریعہ روپیہ کی کاروباری قیمت دس گونہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جتنا روپیہ بنک میں ہوتا ہے اس سے دس گونہ تجارت وغیرہ کا کام ہو سکتا ہے۔

مگر ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں قصبات میں تو کیا بہت سے اضلاع کے صدر مقاموں میں بھی کوئی بنک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے قطعات ایسے ہیں جہاں بیسیوں میل تک نہ پختہ سڑک ہے، نہ ریل ہے۔ نہ نہر ہے نہ تار ہے۔ غرضکہ صنعت و تجارت اور انسانوں کی آبادی اور آسائش کا کوئی سامان نہیں ہے۔ پس ابھی تو ملک آباد کرنے کے لیے اربوں اور کھربوں روپیہ کی ضرورت ہے خواہ وہ اندرون ملک سے فراہم کیا جائے یا بیرون ملک سے حاصل کیا جائے۔

فروری ۱۹۲۶ء

(۳۱) خوش حال ممالک کی پیش بینی کے مقابلہ میں ہماری بے فکری

انگلستان کے مفلسوں کی عمدہ حالت یورپ کی نسبت عام طور پر مشہور ہے کہ وہاں کے ممالک میں ایک طبقہ حد سے زیادہ دولت مند اور دوسرا طبقہ حد سے زیادہ مفلس ہے اور یہ سرمایہ داری کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر ہماری قوم میں بعض صاحب نے اپنا یہ مشن قرار دے لیا ہے کہ وہ سرمایہ کی برائیاں بیان کر کر کے مسلمانوں کو اکتساب دولت سے روکتے رہتے ہیں مگر ذیل کے واقعات سے جو اخبار "ہندوستان" کے ایک نامہ نگار کی تحریر سے لیے گئے ہیں اور جو پچھلے دنوں اکثر اخبارات میں شائع ہوئے تھے واضح ہوگا کہ وہاں کے مفلسوں کے جیسے وحشت انگیز حالات یہاں بیان کیے جاتے ہیں، کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نامہ نگار موصوف نے انگلستان کے ادنیٰ ترین طبقہ کی نسبت لکھا ہے کہ:

(۱) وہ لوگ میلے تھے، باورچی خانہ کے برتن گندے تھے مگر باوجود اس کے وہ ہندوستان کے غریب کلرکوں سے بہتر تھے۔

(۲) غریب لوگوں کے کھانے کا کمرہ علیحدہ دیکھا۔ ایک کمرہ میں غریب لڑکیاں کچھ کام کرتی ہیں۔ قصہ سنانے کا ہال الگ ہے۔ ایک کمرہ پڑھنے وغیرہ کے لیے ہے۔ ایک کتب خانہ ہے۔ ایک ناچ گھر ہے۔

(۳) ادنیٰ سے ادنیٰ مزدوروں کو دو چار پونڈ ہفتہ وار ملتا ہے جس کے سوا سو روپیہ ماہوار سے ڈھائی سو روپیہ ماہوار کے قریب ہوتے ہیں اور جب کوئی شخص بیکار ہو اور اسے نوکری نہ ملے تو گورنمنٹ کی طرف سے ڈیڑھ پونڈ فی ہفتہ یا نوے روپیہ ماہوار ملتا ہے اگر عیال دار ہے تو عورت اور بچوں کا خرچ علیحدہ ملتا ہے۔

(۴) جو اپاہج ہیں اُن کے واسطے علیحدہ انتظام ہے۔ لاوارث بچوں کے لیے یتیم خانے ہیں۔

(۵) ان انتظامات کی وجہ سے انگلستان میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا۔ بھوک سے مرجانا تو بڑی بات ہے۔

(۶) یہی حالت دیگر ممالک یورپ میں ہے بلجیم کے دارالخلافہ میں ہر شخص کو عمدہ کپڑے پہنتے دیکھا۔ غربت کی علامات نظر نہیں آتیں۔ وہاں کوئی شخص تنگ حال نہیں ہے اسی واسطے کوئی بھیک نہیں مانگتا۔

ایک طرف تو یورپ کی خوشحالی کے یہ حالات ہیں۔ دوسری طرف وہاں کے لوگوں کی کشمکش جو وہ حصول دولت کے لیے کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے ملک کی اقتصادی حالت کی درستی کے لیے جن افکار میں مبتلا رہتے ہیں اس کا پتہ ان بے شمار مضامین سے چلتا ہے۔ جو انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑے دنوں ایک مضمون لندن ٹائمز میں شائع ہوا تھا جس سے انگلستان کی پریشانی کا پتہ چلتا ہے۔

یہ امر مثل روز روشن کے واضح ہے کہ انگلستان کا ستارہ اس وقت

انتہائے عروج پر ہی نہ صرف وسعت ملک بلکہ کثرت دولت کے اعتبار سے بھی اس کا شمار دنیا کی اول درجہ کی سلطنتوں میں ہے مگر جو چیز ہر دم ہر کا قدم آگے بڑھا رہی ہے اس کا اندازہ ذیل کی چٹھی سے ہوگا جو ڈاکٹر آرتھر شیپ ویل نے اخبار ٹائمز میں شایع کرائی تھی۔ اس چٹھی میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی قوم کے افراد کے لہو و لعب میں مصروف رہنے اور اسراف کی طرف جھک جانے کی شکایت ان الفاظ میں کرکے اپنے قومی تنزل کا خطرہ ظاہر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی چٹھی کا اقتباس یہ ہے:۔

سو برس پہلے کی حالت سے مقابلہ

"سب سے اول میں لارڈ ایمٹ کی اس تقریر کی طرف توجہ دلاتا ہوں جو انھوں نے دارالامرا میں کی تھی اس تقریر میں انھوں نے ملک کی اقتصادی اور صنعتی حالت کے مخدوش ہونے کو جس کی طرف لارڈ آرنلڈ نے توجہ دلائی تھی تسلیم کرلیا تھا۔ مگر موجودہ حالت کا مقابلہ گزشتہ سو سال کی حالت سے کرکے اپنے دل کو سمجھا لیا ہے۔ بے شک ایسے موقعوں پر پچھلے حالات سے مقابلہ کرکے اپنا دل خوش کیا جاسکتا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے ملک پر پہلے بھی نہایت نازک وقت گزرے ہیں مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ حالات محض عارضی تھے۔ برخلاف اس کے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا میں قومی تنزل بھی ایک چیز ہے جس کا بیج فتحمندی کے وقت جڑ پکڑ لیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم واقعی تنزل کی طرف جارہے ہیں یا ہماری موجودہ

مشکلات مثل سو سال قبل کے محض عارضی اور چند روزہ ہیں؟

ان سوالات کا جواب کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں دے سکتا تاہم میں کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت سے سو سال قبل بلاشبہ ملک کی اقتصادی حالت نہایت خراب تھی اور اس زمانہ میں موجودہ سہولتوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مصیبت کی کوئی حد و انتہا نہ ہوگی تاہم وہ زمانہ گزر کر بہترین زمانہ آگیا مگر یہ زمانہ کس طرح آیا؟

محض کام سے اور کفایت شعاری سے

میرے نزدیک اب جو چیز پریشان کن اور خطرناک ہے وہ حوصلہ اور جانفشانی کی کمی ہے۔ اس زمانہ میں ان لوگوں نے ریل ایجاد کی اور بہت سے مفید انجینیروں کے کام جاری کیے اور واٹرلو کی لڑائی کے نقصانات سے بچا کر ملک کو تباہی اور بربادی سے نکالا۔ اب ایسے باہمت و باحوصلہ لوگ کہاں ہیں؟ اب محض ان کے نقال ہیں بلکہ اب تو نقالوں کی بھی کمی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کی وجہ کھیلوں میں مصروفیت

موجودہ نسل کے لوگوں کو اپنے کام میں دلچسپی نہیں ہے اور انہیں بجز تفریح کے اور کسی چیز کا خیال نہیں آتا۔ لہو و لعب محض تفریح کے لیے نہیں بلکہ بطور حقیقی کاموں کے ہو گئے ہیں مگر لطف یہ ہے کہ جن ورزشوں سے ہم لوگ ناواقف تھے انہیں ورزشوں اور کھیلوں میں ہم ان ممالک سے شکست کھا جاتے ہیں جنہیں ہم بالکل اناڑی کہا کرتے تھے۔

دراصل موجودہ نسل میں کچھ نقائص ایسے ہو گئے ہیں کہ نہ وہ محنتی

کام کرتے ہیں اور نہ اچھا کھیلتے ہیں اور اب سب سے بڑھ کر یہ کہ

ان میں اسراف بہت بڑھ گیا ہے

جس کی وجہ سے ان میں حوصلہ اور قوت ایجاد کم ہوگئی ہے اسی اسراف کی وجہ سے ملک میں صنعتی کاموں کے لیے سرمایہ کی کمی محسوس ہو رہی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ بہ کثرت روپیہ لذت اور عیش پرستی میں صرف ہو جاتا ہے۔ یہ حالت جنگ عظیم کے بعد سے ہوگئی ہے جب کہ روپیہ ایسے اشخاص میں پہونچا ہے جو اس کا مصرف بجز صرف کر ڈالنے کے اور کچھ نہیں جانتے۔ آج کل فضولیات پر جس قدر صرف ہو رہا ہے اس قدر کبھی نہیں ہوا اور فضول چیزوں کی تجارت کبھی اتنی سرسبز نہیں ہوئی۔ اگر کسی غیر ملک کے شخص سے کہو کہ ہماری حالت خراب ہوتی جاتی ہے تجارت گر رہی ہے۔ بیکاروں کے غول کے غول پھر رہے ہیں صنعت کم ہو رہی ہے تو وہ اس کا یقین نہ کرے گا اور قہقہہ لگائے گا حالانکہ یہ بالکل صحیح اور درست ہے کیونکہ زیادہ تر روپیہ ہم عیش اور تنعم اور لہو و لعب میں صرف کر رہے ہیں پہلے زمانہ میں لوگوں کو کام میں بھی اتنا ہی لطف آتا تھا جتنا کہ اب کھیل میں آتا ہے خلاصہ یہ کہ سو سال قبل جس چیز نے ہمارے ملک کو آزادی دلائی وہ

کام اور کفایت شعاری تھی

پس جب تک کہ اس پر عمل نہ ہوگا حالت بہتر نہ ہوگی۔ جرمنی کے مالیہ کا رونا تو رویا جاتا ہے مگر ان سے سبق نہیں سیکھا جاتا۔ اُن کے صرف کاریگر ہی کام نہیں کرتے بلکہ سب لوگ کام کرتے ہیں۔"

نتیجہ ان تحریرات سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل یورپ با وجود انتہائی تمول کے ہر وقت اپنی حالت بہتر کرنے کے افکار میں مبتلا رہتے ہیں اور یہی اُن کی ترقی کا راز ہے۔ برخلاف اس کے اہل ہند اور بالخصوص مسلمانوں کی حالت تو یہ ہے کہ اُن کے امرا اپنے عزیزوں ہمسایوں اور مفلس ہم قوموں کے آئے دن کے مطالبات سے تنگ رہتے ہیں۔ اور غیر محدود چندوں سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ بیوپار اور تاجر، کاریگر اور کاشتکار سرمایہ داروں کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جو لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں بیکار، معذور، محتاج۔ پردہ نشین بیوائیں، یتیم اور مریض ہیں اُن کے آلام ومصائب تو ناقابل بیان ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اُن کی سوسائٹی میں اسلامی ممالک کے حالات پر مباحثے ہوتے ہیں۔ نجدیوں اور حجازیوں کے مضمون پر سر پھٹول ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی وفات اور حیات کے مسئلہ پر لٹھ چلتے ہیں۔ استغنا اور بے توجہی اگر کسی مسئلہ سے ہے تو وہ محض اقتصادی ہے جس پر اس زمانہ میں قوموں کی موت وحیات کا انحصار ہے۔

بہرحال اس درجہ پہ پہونچکر بھی اگر مسلمانوں کو اپنی مالی حالت کی طرف توجہ نہ ہوئی تو ان کی قومی موت میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔

مارچ ۱۹۲۶ء

(۳۲)

میں کس طرح کفایت شعار بن گیا

میں ابتدا سے بہت مسرف تھا۔ جو کچھ ملتا وہ خود کھاتا اور دوسروں کو کھلاتا۔ بچپن میں تو اس عادت کی وجہ سے لوگ فیاض کہہ کہہ کر مجھے خوب بڑھاوا دیتے تھے۔ مگر عمر کے ساتھ یہ فیاضی بڑھ کر میرے لیئے مستقل مرض کی طرح ہوگئی۔ اول تو ماں باپ سے، پھر عزیزوں سے مانگتے مانگتے مجھے ہاتھ پھیلانے کی عادت ہوگئی تھی اور بڑا ہو کر جب ضرورتوں نے مجھے گھیرا تو میرا کام یہ ہوگیا کہ اپنی محدود آمدنی کے بھروسہ پر جہاں سے قرض ملے لے کر خرچ کر ڈالوں اور اُسے کبھی ادا نہ کرسکوں۔ بالآخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ قرض خواہوں اور ڈگری داروں کے خوف سے گھر سے باہر نکلنا دشوار ہوگیا۔ اس پریشانی میں ایک روز میں نے اپنے قرضہ کی مقدار اور جائداد کی آمدنی کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ سالانہ آمدنی سے دس گونہ قرضہ ہے۔ اس سے میرے قلب کی یہ حالت ہوگئی کہ گویا وہ ڈوبا جارہا ہے اور مجھے معلوم ہوا کہ موجودہ آمدنی سے قرضہ ادا ہونا محال ہے۔ مگر اس وقت مجھے یہ سوجھا کہ میں اپنی سالانہ آمدنی کو دونوں پر بلکہ گھٹنوں پر پھیلاؤں۔ میری جائداد کا منافعہ سات ہزار روپیہ سالانہ سے کچھ زیادہ ہے جس کی وجہ سے اپنے قصبہ میں اپنے آپ کو رئیس اعظم سمجھتا تھا۔ اور اس کے بھروسہ پر میں سیکڑوں روپیہ معمولی کاموں میں صرف

کر ڈالنے میں کچھ بھی تامل نہ کرتا تھا۔ مگر اس آمدنی کو روزانہ پر پھیلایا تو بیس روپیہ
روز ہوا اور گھنٹوں پر پھیلایا تو کل تیرہ آنہ چار پائی ہوئے۔ میرے بچوں اور
متعلقین کی تعداد علاوہ ملازموں کے گیارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کی تعلیم اور
شادی بیاہ کا حساب لگایا جائے تو ان پر اوسط خرچ بہت پڑتا ہے تاہم
اگر میں اپنا حصہ گھر کے دیگر افراد سے تین گونہ بھی لگاؤں تو میرے حصہ
میں فی گھنٹہ تین آنے پڑتے ہیں جسے میں اپنا سمجھ کر صرف کر سکتا ہوں۔ اس
تصور نے مجھے مبہوت کر دیا اور مجھے معلوم ہوا کہ میں کس قدر غریب شخص ہوں
اس خیال نے میری حالت یہ کر دی کہ جب کوئی خرچ درپیش ہوتا تو میں
گھنٹوں حساب لگاتا کہ کتنے گھنٹوں یا دنوں یا مہینوں کی آمدنی میں
ایک دفعہ صرف کیے ڈالتا ہوں اور اس کی وجہ سے مجھے کتنے عرصہ تک خرچ
بند کرنا پڑے گا۔ ان حسابوں سے اپنے اخراجات گھٹانے پر مجبور ہونے لگا
اور اب تو یہ واہمہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ایک دفعہ میں کل تین آنے خرچ
کرتے ہوئے میری روح قبض ہوتی ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ایک
گھنٹہ کی آمدنی ہے جس میں کھانا کپڑا، سفر، مہمان داری، خیرات، زکوٰۃ
سب چیزیں شامل ہیں۔ مگر فی الجملہ اس واہمہ نے مجھے یہ فائدہ پہنچایا ہے
میری خست کو دیکھ کر سب گھر والے کفایت شعار بن گئے۔ میرا تمام قرضہ
چند سال میں ادا ہو گیا اور اب میرا اور میرے بال بچوں سب کا ملا کر
پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کے قریب بنکوں میں جمع ہے اور نفع آور کاموں میں لگا
ہوا ہے جس سے صدہا کاریگروں کی پرورش ہوتی ہے اور نہ صرف روپیہ بلکہ

اُسی کے ساتھ میرا خون روز بروز بڑھ کر میری جسمانی قوت کو بڑھاتا جاتا ہے
پس میں اپنے سب بھائیوں سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اس نسخہ کا تجربہ کریں اور
اپنی سالانہ یا ماہوار آمدنی کا کبھی بھول کر خیال بھی نہ کریں بلکہ روزانہ اور
گھنٹہ وار آمدنی کو ہر وقت پیش نظر رکھا کریں۔ البتہ اگر جلد برباد ہونے کا
شوق ہو تو ماہوار اور سالانہ آمدنی کا خیال بھی فضول ہے۔ اپنی زندگی کا
تخمینہ کر کے پچاس برس کی آمدنی جوڑیں اور اتنا بہت سا روپیہ قرض لیکر
خوب لطف اٹھائیں اس کے بعد بھیک مانگتے پھریں۔ فقط

مارچ ۱۹۲۶ء

---

(۱۴۳)

ضلع گوڑگانوہ کے مسلمانوں کی حالت

(یہ وہ تقریر ہے جو سید طفیل احمد صاحب نے صوبہ پنجاب کی مسلم
تعلیمی کانفرنس کے جلسہ منعقدہ ۲۱ فروری ۱۹۲۶ء میں بمقام
ریواڑی کی تقریر کے وقت حاضرین کے سامنے ایک بڑا نقشہ
آویزاں کیا گیا تھا جس میں مسلمان خواندہ اشخاص کی نسبتی حالت
دکھائی گئی تھی)

جناب صدر اور معزز حاضرین!

کل کے جلسہ میں جناب مولوی رحیم بخش صاحب کے سی آئی ای

صدر استقبالیہ نے اس ضلع کے تعلیمی اعداد و شمار آپ کو سنائے تھے آج ان اعداد کو ایک نقشہ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اپنے بھائیوں کی حالت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اس نقشہ سے آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ اس ضلع میں جملہ اقوام کے خواندہ اشخاص کی تعداد کل تین فی صدی ہے اور ہندوؤں کو علیٰحدہ کرکے دیکھا جائے تو ان کے خواندوں کی تعداد ۴½ فی صدی یعنی اوسط سے کسی قدر زیادہ ہے مگر یہ دیکھ کر آپ کو افسوس ہوگا کہ مسلمان خواندگان صرف ۱.۶ فی صدی یعنی ہندوؤں کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم ہیں۔ خیر ہندوؤں سے مقابلہ کو جانے دیجئے اور خود اپنی حالت کو دیکھیے کہ ایک سو مسلمانوں میں سے صرف ڈیڑھ کے قریب خواندہ اور ۹۸½ ناخواندہ ہیں پس جس قوم میں ناخواندوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو، صاف ظاہر ہے کہ وہ کسی فن اور کسی پیشہ میں اپنی حیثیت قایم نہیں رکھ سکتی۔

اس ضلع میں مسلمانوں کی زیادہ تعداد کا شتکاری پیشہ ہے۔ مگر اب وقت آرہا ہے کہ کاشتکاری کا قیام بھی بغیر خواندہ ہونے کے نہ رہ سکے گا آپ نے سنا ہوگا کہ زراعت کی ترقی کے لیئے گورنمنٹ کی طرف سے خاص طور پر کوشش ہو رہی ہے اور آئندہ وہ ایسے لوگوں کو جو فن زراعت کے ماہر ہیں مخصوص طریقہ پر زراعت کی طرف توجہ ہوگی مگر اس توجہ سے بھی زیادہ تر وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جو تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہوں گے پس مسلمانوں کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ پوری قوت اور کوشش سے اپنی قوم میں خواندوں کی

تعداد بڑھائیں اس کے لئے حسب ذیل صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) سب سے اول ہر شخص اپنے بچہ کو مدرسہ یا مکتب میں بھیجے۔

(۲) اگر اپنا کوئی بچہ نہیں ہو تو کسی غریب بچہ کو خرچ دے کر اسے مکتب میں بھیجے۔

(۳) اگر خود لکھا پڑھا ہو تو اپنے بچوں کو مکتب میں بھیجنے کے علاوہ اپنے کسی جاہل نوکر یا پڑوسی کو دن رات میں چند لمحے سبق دے کر اسے خواندہ بنائے۔

(۴) اگر خود ناخواندہ ہو تو کسی مکتب یا مدرسہ میں تھوڑا بہت چندہ دے کر اپنے جاہل بھائیوں کو خواندہ بنانے میں مدد دے۔

یہ باتیں تو ایسی عرض کی گئی ہیں جو ہر شخص فرداً فرداً کر سکتا ہے۔ اب رہے وہ اصحاب جو تعلیم یافتہ، ذی حیثیت اور سرکاری امداد حاصل کرنے کے طریقوں سے واقف ہیں۔ وہ اپنے جاہل بھائیوں کی حالت پر رحم کھا کر اُن کی تعلیمی سطح کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت جتنے فی صدی ہمارے ہاں جاہل ہیں بالعموم اتنے فی صدی یورپ کے ممالک میں خواندہ ہیں پس ہمارے سامنے اتنا عظیم الشان کام ہے کہ جب تک کہ ہم متفق ہو کر پوری توجہ اور کوشش سے اُسے شروع نہ کریں گے اُس کا انجام پانا مشکل ہے۔

اقتصادی حالت

دوسرا مسئلہ اس ضلع کے مسلمانوں کی مالی حالت کا ہے۔ میں بطور نمونہ کے میووں کی حالت آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو تعداد میں خدا کے

فضل سے زیادہ ہیں اور ان کی ایک قوم ہے۔

۱۹۱۱ء کے گزیٹیر میں ۱۸۷۹ء کے قحط کی رپورٹ سے کچھ اقتباسات کیے گئے ہیں جن کے تحت میں لکھا گیا ہے کہ جو حالات ۱۸۷۹ء میں تھے وہ بجنسہ اب بھی موجود ہیں اس لیے اس موقع پر ان کی بنا پر استدلال کرنا چنداں بے محل نہ ہوگا۔

رپورٹ مذکور میں تحریر ہے کہ:-

(۱) سب سے زیادہ محنتی، کفایت شعار، اور سمجھدار قوم اہیروں کی ہے جو اراضی وہ کاشت کرتے ہیں ادنیٰ قسم کی ہے اُن کے دیہات میں مالگزاری کی مقدار بھی اور جگہ سے زیادہ ہے تاہم مسلسل محنت سے اُنھوں نے اس گھٹیا اراضی سے اس قدر پیدا کیا اور اتنے اس قدر کفایت سے صرف کیا کہ ان کی اراضی قرضہ سے پاک وصاف ہے۔

(۲) اُن کے بعد جاٹوں کا نمبر ہے جن کے پاس اراضی زرخیز ہے اور مالگزاری کم ہے یہ لوگ اہیروں سے کم مگر دیگر اقوام سے زیادہ کفایت شعار اور سمجھدار ہیں مگر اپنی زمین کو قرضہ اور کفالت سے پاک نہ رکھ سکے۔

(۳) جاٹوں کے بعد راجپوت اور برہمن منتشر طور پر ہیں مگر زمیندار پیشہ لوگوں میں اُن کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

(۴) البتہ سب سے آخر کے نمبر پر میو قوم ہے جس کے ۳۵۰ موضعات ہیں جو نہایت سست اور حد درجے کے مسرف اور فضول خرچ ہیں نہ انھیں بنجر زمین کا عذر ہو سکتا ہے اور نہ زیادہ مالگزاری کا تاہم ان کا خرچ اُن کی آمدنی

کے اس قدر قریب رہتا ہے۔ وہ اپنی آراضی کو ترقی دینے کی طرف سے اس قدر غافل ہیں، اور فضول خرچی میں اس قدر مبتلا ہیں کہ اگر ایک فصل بھی خراب ہو جاتی ہے تو وہ فوراً قرضہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

دوسرے موقعہ پر آبپاشی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"اہیر گہرے کنوئیں کھدواتے ہیں اور ان سے دن رات کام لیتے ہیں بخلاف اس کے میو ان مقامات میں بھی کنوئیں نہیں کھدواتے جہاں پانی قریب ہوتا ہے"

ایک اور موقعہ پر لکھا ہے کہ

"ریواڑی کی ہلکی زمین کفایت شعار اہیروں کو کافی پیداوار دے کر انھیں آرام سے رکھتی ہے مگر اس کے مقابلہ میں تحصیل فیروز پور کی زرخیز زمین مسرف میوؤں کی فضول خرچیوں کی وجہ سے کثیر رقم کے عوض میں رہن ہے"

پھر مال گذاری کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

"تحصیل ریواڑی کے اہیر زمینداران پر مال گزاری نہایت زیادہ بڑھائی گئی تھی بمقابلہ تحصیل فیروز پور کے میوؤں کے جن پر نہایت ہلکی مالگذاری قایم کی گئی تھی بہت کم مقروض ہیں" پھر لکھا ہے کہ میوؤں کی حالت نہایت سرعت کے ساتھ مایوس کن ہو رہی ہے۔ وہ معمولی زمانہ میں شادی اور غمی کے اخراجات میں اور عیش پرستی کی چیزوں میں اس قدر زیادہ صرف کرتے ہیں کہ جب خشک سالی آجاتی ہے تو وہ مہاجن کے ہاتھوں میں پڑ جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور مہاجن جس شرح سود پر چاہتے ہیں انھیں قرض دیتے ہیں۔ رہن آراضی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ

تحصیل فیروزپور میں جہاں زیادہ تر میو قوم رہتی ہے اور جو اسراف اور فضول خرچی کے لیے ضرب المثل ہے وہ سب سے زیادہ مقروض ہے۔

شرح سود کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ بارہ فی صدی اور چوبیس فی صدی اور ۷۵ فی صدی سالانہ ہے خوش حال لوگوں کے لیے شرح سود سب سے کم ہے اور غربا کے لیے جن میں نوح اور فیروزپور کے میو شامل ہیں شرح سود سب سے زیادہ ہے"

ان اقتباسات سے آپ کو میوؤں کی قابل رحم اور قابل افسوس حالت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ زراعت پیشہ لوگوں کا افلاس دور کرنے کے یہی طریقے ہو سکتے ہیں۔

(۱) اُن کے لیے عمدہ زمین فراہم کی جاوے۔

(۲) آبپاشی کے ذرائع بہم پہنچائے جاویں۔

(۳) اگر مال گزاری زیادہ ہو تو اسے گھٹایا جائے۔

گر مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں باتیں میوؤں کو بمقابلہ دیگر اقوام کے کہیں زیادہ حاصل ہیں مسلمانوں کو اکثر یہ شکایت رہتی ہے کہ اُن کی تعداد کم ہے وہ دوسرے لوگوں سے دبے ہوئے ہیں اس لیے ترقی نہیں کر سکتے مگر صرف اس ضلع کی دو تحصیلوں میں اُن کی کثیر آبادی پائی جاتی ہے اور ۳۵۰۰۰ مواضعات میں آباد ہیں۔

اس رپورٹ میں پانچ قوموں کی تفصیل دی گئی ہے جو زراعت پیشہ ہیں یعنی آہیر، جاٹ، راجپوت، برہمن اور میو۔ مگر یہ کس قدر شرمناک

بات ہے کہ میوؤں کی حالت سب سے بدتر دکھائی گئی ہے پھر یہ کہ اُن کے
پاس زمین زرخیز ہے۔ آب پاشی کے لیئے پانی قریب ہے اور اُن پر مال گزاری
کم ہے تاہم وہ اُن لوگوں کے مقابلہ میں بدحال، مقروض اور مفلس ہیں
جن کی زمین ریتلی، کنوؤں کا پانی گہرا اور مال گزاری زیادہ ہے۔

یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے۔ اس کا جواب بھی اسی رپورٹ میں دیا گیا ہے
کہ وہ مسرف اور فضول خرچ ہیں اور شادی غمی میں زیادہ صرف کرتے ہیں اور محنت
کم کرتے ہیں۔

مگر یہ مرض تو صرف میوؤں میں نہیں بلکہ ہر طبقہ کے اور ہر جگہ کے رہنے
والے مسلمانوں میں کم وبیش یکساں ہے شہروں میں چونکہ تکلفات کی چیزیں زیادہ
بکتی ہیں اور انھیں دیکھ کر شخص کا جی للچاتا ہے اور اس وجہ سے وہاں زیادہ
فضول خرچی ہوتی ہے تو بعض صاحب اس کا یہ علاج تجویز کرتے ہیں کہ دیہات
کی سادہ زندگی اختیار کی جائے۔ مگر دیہات میں جا کر مسلمانوں کے اسراف
اور بربادی کے یہ حالات معلوم ہوتے ہیں تو بے اختیار زبان سے نکلتا ہے

بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست

مانا کہ دیہات کے لوگوں کو لکھا پڑھا کر ہم مثل اپنے تعلیم یافتہ بنائیں گے
جس سے وہ اپنی زراعت کے کام کو بہتر طریقہ سے کریں، انھیں صنعت و
حرفت سکھا کر اچھے کاریگر بنائیں گے۔ انھیں تجارت کی تعلیم دلا کر تاجر بنائیں گے
انھیں سرکاری عدالتوں کے کام بتا کر وکیل، بیرسٹر اور بڑے بڑے عہدہ دار
بنائیں گے انھیں کونسلوں کے ممبر بنائیں گے جن کے ہاتھوں میں ملکی حکومت

کی باگ ہوتی ہے۔ مگر اتنے مراتب اور منازل طے کرنے کے بعد بھی اگر ہر شعبۂ زندگی میں
ہم دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے غلام بنے رہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر
تمام کشمکش کا کیا نتیجہ ہو۔ بڑے بڑے شہروں میں جو تجارت کے مرکز ہیں ہم یہ
سن کر خوش ہوا کرتے ہیں کہ وہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں اور ہمارے دلوں میں
یہ ولولہ پیدا ہوتا تھا کہ ہم بھی تجارت سیکھ کر بڑے بڑے تاجر بنیں۔ مگر آج ان
شہروں میں جا کر دیکھیے کہ وہ کن لوگوں کا سرمایہ استعمال کرتے ہیں اور کس
طرح وہ دوسروں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہی حالت کاریگروں
کی ہے اور نہ صرف کاریگروں کی بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں ہر طبقہ کے مسلمانوں
کی بہت بڑی تمنا مسلمانوں کو یہ تھی کہ انھیں حکومت میں برابر کا حصہ ملے مگر
حکومت میں حصہ ملنے کے بعد جو کارگزاری صوبہ بنگال کے مسلمان ممبروں نے
کی اس کا اندازہ سر عبدالرحیم صاحب کے خطبۂ صدارت سے جو مسلم لیگ کے
جلسہ میں پڑھا گیا تھا، آپ کو بخوبی ہو سکے گا۔

سر عبدالرحیم صاحب موصوف نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ
"کمزور حلقۂ انتخابات کے لوگ باوجودیکہ سب کے سب مسلمان ہیں
تاہم زمینداروں، قانون دانوں اور ساہوکاروں حتیٰ کہ مقامی عہدہ داروں
کے جو زیادہ تر ہندو ہیں زیر اثر ہیں"

اسی خطبہ میں جناب موصوف نے دوسرے موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا
کہ "نیز بنگال اور پنجاب میں جہاں کہ مسلمانوں کی مردم شماری سب سے زیادہ
ہے اور دیگر اقوام سے کسی قدر بڑھی ہوئی ہے ووٹ دہندگان پر منافی نتیجہ

اور منظم جماعتوں کا اثر پڑتا ہے۔ اس بارہ میں تمام ملک میں ہندوؤں کو بہترین مواقع حاصل ہیں کیوں کہ وہ لوگ بوجہ ساہوکار اور بینکر، قانون پیشہ اور زمیندار ہونے کے اور نیز بہ اعتبار جملہ محکمہ جات میں عہدہ دار ہونے کے بڑا اقتدار رکھتے ہیں۔ ہماری سیاسی کمزوری بنگال میں بالکل ظاہر ہے جہاں کی مردم شماری تمام ہندوستان کی ایک ثلث ہے اور اپنے صوبہ میں پچپن فی صدی ہے (باوجود اس زیادتی تعداد کے) نصف یا نصف سے زیادہ مسلمان ممبران کونسل / ہندو لیڈران کے اقتدار، مالی امداد اور ان کی تنظیم کی بدولت منتخب ہوئے ہیں اس کے متعلق چند تمثیلات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) بعض سیاسی اختلافات کی وجہ سے ایک زمانہ میں دو مسلمان منسٹر تھے مگر وہ ایک جماعت کے اختلاف سے جس میں بیس مسلمان رائے دہندے شامل تھے اپنے عہدوں سے نکالے گئے۔

(۲) بنگال میں جب ہندو مسلم میثاق کا مسئلہ اٹھا تو بہت سے مسلمان ممبر اس سیاسی جماعت میں شامل ہو گئے جو ہوشیار ہندوؤں کے زیر اثر تھی اور جسے وہ مالی امداد دیتے تھے جب اس مسئلہ پر کونسل میں بحث پیش ہوئی تو ان مسلمان اصحاب نے ہندوؤں کو اپنے ووٹوں سے مدد دے کے اس قدر اہم مسئلہ کو جس کا اثر تمام ملک کے مسلمانوں پر پڑتا ہے غیر محدود زمانہ کے لیے ملتوی کرادیا

(۳) پچھلے دنوں گورنمنٹ کی طرف سے ڈھاکہ یونیورسٹی کی سالانہ امداد کے لیے ایک مسودہ قانون پیش ہوا تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی خاص کر مسلمانوں

کے لیئے نہایت مفید ہی اور اس کی حکمراں جماعت میں نصف کے قریب مسلمان ممبر ہیں۔ تاہم مسلمان سوا راجی ممبروں نے متحد ہو کر اس مسودہ کے خلاف ووٹ دیئے اور ایک صاحب نے تو یہ کیا کہ تقریر تو اس بل کے موافق کی تا کہ مسلمان ووٹ دہندگان خوش رہیں مگر ووٹ اس کے خلاف دیا۔

(۴) بنگال میں نوے فی صدی مردم شماری کاشتکاروں کی ہی جن میں مسلمان زیادہ ہیں ان کی اصلاح کے لیئے قانون کا ایک مسودہ کونسل میں پیش ہوا مگر جس سلیکٹ کمیٹی کے سپرد وہ مسئلہ ہوا اس کے ممبر بڑے بڑے زمیندار تھے جب یہ تجویز پیش ہوئی کہ اس کمیٹی میں کچھ ایسے ممبر بھی بڑھا دیئے جاویں جو غریب کاشتکاروں کی نیابت کریں تو ان میں مسلمان ممبروں نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔

ان چار واقعات کے معلوم ہونے کے بعد جو سر عبدالرحیم صاحب نے بیان کیئے اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات کی تہہ میں ان کی ضرورتمندی ہی جو اس بات کا نتیجہ ہی کہ وہ خواہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ کمائیں اُن کے اخراجات اُن کی آمدنی سے زیادہ رہتے ہیں موجودہ حالت میں جب کہ مسلمان افراد قومی حقوق کو ذاتی منافع پر قربان کر ڈالنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کی حالت قابل رحم ہی نہ کہ قابل نفریں، کیوں کہ وہ نہیں جانتے کہ کیا کریں۔ سر عبدالرحیم صاحب اس قومی مرض کے دو علاج تجویز کرتے ہیں اول یہ کہ مسلمان سیاسی امور کی تعلیم و تربیت حاصل کریں

مگر گزشتہ بارہ سال کے اخبارات اُٹھا کر دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے دماغ میں بجز سیاست کے اور کوئی چیز آتی ہی نہیں۔ تاہم اُن کی حالت روز بروز بدتر ہو رہی ہے۔ دوسرا علاج یہ تجویز ہوا ہے کہ کونسلوں میں مسلمان اپنی جماعت بنائیں۔ مگر جماعت بنانے کی قوت ہوتی تو وہ واقعات ہی کیوں پیش آتے جو سر عبدالرحیم صاحب نے بیان فرمائے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادتی تعداد اور کونسلوں میں مسلمانوں کی کافی نیابت بھی قطعاً بے اثر ہے جبکہ وہ اپنی ذاتی ضروریات کی وجہ سے دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں مثل کٹھ پتلیوں کے ناچنے پر مجبور رہتے ہیں۔

بہر حال آپ اصحاب کی خدمت میں عرض ہے ہماری قوم کی قابل فخر ہستیاں موجود ہیں۔ نہایت ادب سے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ جو علاج مسلمانوں کو بربادی سے بچانے کے لیے کیے جا رہے ہیں ان میں کچھ نہ کچھ نقص ضرور ہے اور ضرورت ہے کہ اس نقص کو معلوم کر کے اسے رفع کر کے قوم کے سامنے اس کے مرض کا صحیح علاج پیش کیا جائے۔ میں اپنے زعم میں صحیح علاج پیش کرنے کے لیے تیار ہوں مگر جب تک کہ جناب صدر مجھے اس کی اجازت نہ دیں میں کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہوں۔

(مقرر کا وقت چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لیے وہ بیٹھ گئے۔ حاضرین میں سے اکثر نے اصرار کیا کہ مرض کا صحیح علاج بیان کیا جائے۔ مگر جناب صدر کے سامنے کام زیادہ تھا اس لیے انھوں نے کسی قدر تأمل کے ساتھ کچھ وقت اور دیا۔ مگر چونکہ وقت کی تنگی میں بیان کا کچھ لطف نہ تھا اس لیے چند

الفاظ کہنے کے بعد مقرر بیٹھ گئے تاہم مقرر کے جو کچھ خیالات اس بارہ میں ہیں وہ اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے قومی مرض کا صحیح علاج

جو ناظرین سود مند کے لیئے کوئی نئی چیز نہیں ہے وہ یہ ہے:-

(۱) صیغہ انجمن ہائے امداد باہمی سے پورا نفع اٹھایا جائے اور کثیر تعداد میں انجمن قائم کرنے کی کوشش کی جائے اور جن صوبہ جات میں وہ کامیاب نہیں ہیں وہاں بذریعہ قانونی ترمیمات کرانے کے انہیں زیادہ کارآمد بنا کر مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھائیں۔

(۲) تجارتی کاروبار میں سہولت پیدا کرنے کے لیئے مسلمانوں میں بینک کا کاروبار جاری کیا جائے۔ موجودہ بینکوں میں اپنا سرمایہ پہونچا کر اپنا اثر پیدا کیا جائے اور خود اپنے بینک اور مہاجنی کی کوٹھیاں قائم کی جائیں۔

(۳) جن مقامات میں انجمنہائے امداد باہمی یا بینکوں کے قائم ہونے کے مواقع نہ ہوں وہاں انفرادی طور پر مسلمان روپیہ کا کاروبار کریں اور خاصکر مسلمان کاشتکاروں، کاریگروں اور دستکاروں کو معین منافعہ پر روپیہ دیکر انہیں دیگر اقوام کے سرمایہ داروں کی غلامی سے آزاد کرائیں۔

(۴) مدارس، مساجد اور اوقاف کے منتظموں کو آگاہ کیا جائے کہ وہ اپنا نقد روپیہ بینکوں میں جمع کر کے اسے محفوظ کریں اور اس کے منافع کو صرف میں لاویں۔

(۵) اپنے گھروں میں اور درسگاہوں میں بچوں کو روپیہ جمع کرنے اور اسے

بڑھانے کے طریقے بتائے جائیں اور زیادہ روپیہ جمع کرنے پر انھیں انعام دیئے جائیں۔

(۴) مسلمانوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اپنے پس ماندگان کو افلاس و گداگری سے محفوظ رکھنے کے لیئے اپنی زندگی کا بیمہ کرائیں اور اپنے بچوں کا تعلیمی بیمہ کرائیں۔

اپریل ۱۹۲۶ء

---

(۴۳)

سود مند کے دوسرے سال کا پروگرام

سود مند کا بارھواں پرچہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے جس کے بعد اس کی زندگی کا دوسرا سال شروع ہوگا۔ پہلے سال میں ناظرین نے جو اس کی قدر افزائی فرمائی ہے اس کا اندازہ ان چند خطوط سے ہوا ہوگا جو اس کے مختلف نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع کیئے گئے۔ یہ خطوط منجملہ صدہا خطوط کے ہیں۔ حال میں جو خط راجہ اکبر علی خاں صاحب متوطن موضع پدھری ضلع جہلم سے موصول ہوا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"آپ کا مجلد رسالہ سود مند وصول پایا اور زیر مطالعہ رکھا ہوا ہے۔ ہر روز ایک سیر خون تازہ جوش سے پیدا ہوتا ہے۔ آفرین

صد آفریں اس قدر خیال اور مغز پر اب بھی اگر ہمارا ن
کے خفتہ نصیب نہ جاگیں گے تو حیف ہی۔ مبارک اور
ہزاروں شاباش مصنف صاحب کو۔ میری زبان
تعریف نہیں کر سکتی۔ خدا آپ پر رحمت نازل فرمادے۔
اور ضرور خداوند ذو الجلال اجر عظیم دے گا!!

اس قدر حوصلہ افزا خطوط کا اقتضا تو یہ تھا کہ ہم سود مند کے موجودہ طرز کو کافی سمجھتے مگر جو کام ہمارے پیش نظر ہی وہ چونکہ نہایت اہم اور عظیم الشان ہی اس لیئے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی ہی کہ کس طرح مسلمانوں کی قوم کو افلاس و ناداری کے گرداب سے جلد سے جلد نکالا جائے۔ مگر ظاہر ہی کہ یہ اتنا بڑا کام ہی کہ اسے ایک یا چند لوگ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ ہر مقام اور ہر پیشہ کے تجربہ کار اصحاب اپنے اپنے تجربات اور خیالات سے اپنے بھائیوں کو فائدہ پہونچانے پر کمربستہ نہ ہو جائیں۔ اور سود مند کی وساطت سے باہمی تبادلۂ خیالات نہ کرتے رہیں۔ بعض اصحاب کو ممکن ہی کہ یہ خیال ہو کہ مضامین لکھنے کے لیئے عمدہ زبان اور انشا پردازی کی ضرورت ہی۔ مگر سود مند تو محض ایک اقتصادی پرچہ ہی جس کے لیئے صرف تجربہ اور ایک دردمند دل کی ضرورت ہی۔ اس لیئے ناظرین سود مند کی خدمت میں عرض ہی کہ جو تدابیر اپنی قوم و ملک کی مالی حالت کی درستی کے لیئے مفید سمجھتے ہوں وہ بلا تکلف ہمیں لکھتے رہیں اور حتی الامکان حسب ذیل عنوانات کو پیش نظر رکھ کر مضامین مرتب فرمائیں۔

(۳۵)

کوآپریشن کیا چیز ہی؟

یہ امر مسلمہ ہی کہ دُنیا کا کوئی پیشہ روپیہ کے بغیر نہیں چلتا۔ زمیندار و کاشتکار دُکاندار اور کاریگر سب کو ہر وقت روپیہ کی ضرورت رہتی ہی۔ کاشتکار کو اس لیے کہ بیل، آلات زراعت اور بیج وغیرہ فراہم کرے، اگر یہ سب چیزیں ایک بار مل بھی جائیں مگر وقت پر بارش نہ ہو اور کھیتی ماری جائے تو دوسری فصل تک کھانے کے لیے غلہ اور بونے کے لیے بیج کی ضرورت ہوتی ہی۔ اسی طرح دُکاندار اور کاریگر کو اپنی اپنی ضرورت کے سامان فراہم کرنے کے لیے روپیہ کی ضرورت رہتی ہی۔ ان جماعتوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے ہر ملک میں سرمایہ داروں کی ایک جماعت ہوتی ہی جو گراں شرح سود پر انھیں روپیہ دیتی ہی اور اپنے روپیہ کے زور سے جس قسم کا ناچ چاہے ان بے بس اور بے کس لوگوں کو نچاتی ہی۔ ایسا حال نہ صرف ہندوستان ہی بلکہ کم و بیش تمام دُنیا میں سرمایہ داروں کا زور ہی مگر کچھ عرصہ سے ان کے چنگل سے نکلنے کی ایک تدبیر نکل آئی ہی جس کا تجربہ کامیابی کے ساتھ ہو رہا ہی۔ یہ تدبیر انجمنہائے امداد باہمی قائم کرنے کی ہی۔ جس کی ابتدا ساٹھ سال سے زیادہ ہوا۔ سب سے اول ملک جرمنی میں ایک شخص مسمی ریفائزن نے کی تھی۔ ان انجمنوں کے ذریعہ سے یورپ کے بہت سے ملکوں میں غریب کاشتکاروں اور کاریگروں کی

حالت میں بہت ترقی ہوگئی اور اب بیس بائیس سال سے ہندوستان کے
مختلف صوبوں میں کوآپریشن کے تجربہ میں خوب کامیابی ہو رہی ہے۔

(۱) کوآپریشن کا قانون ہندوستان میں سب سے اول سنہ ۱۹۰۴ء میں پاس
ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۲ء میں اس میں چند اہم ترمیمات ہوئیں اور وہی سنہ ۱۹۱۲ء
والا قانون اب تک ہندوستان میں نافذ ہے۔ اس قانون کی رو سے یہ ضروری
ہے کہ جو لوگ انجمن امداد قرضہ قائم کرنا چاہیں اُن کی تعداد کم سے کم بیس ہو۔
انجمن کے ہر ممبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کم سے کم ایک حصہ لے مگر کوئی شخص بیس
حصوں سے زیادہ نہیں لے سکتا۔ تاکہ ایک شخص زیادہ حصے لیکر سوسائٹی پر قابض
نہ ہو جائے پھر یہ کہ ایک حصہ کی قیمت صرف بیس روپیہ رکھی گئی ہے۔ جو
دس سال کی بیس ششماہیوں میں ایک ایک روپیہ کرکے وصول کی جاتی ہے
گویا ایک حصہ کی بابت چھ مہینے میں صرف ایک روپیہ دینا پڑتا ہے جو ادنیٰ
سے ادنیٰ مزدور آسانی سے دے سکتا ہے۔ مگر اس قدر خفیف رقم سے اس قدر
قوت ان غربا میں پیدا ہو جاتی ہے کہ بالعموم دس سال کے عرصہ میں یہ لوگ
مہاجن کے چنگل سے بالکل نکل جاتے ہیں۔ اور اُس کے بعد طرح طرح کے کاروبار
کرکے روز بروز خوشحال ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غربا کے جمع کیے ہوئے ایک ایک
روپیہ میں اس طریقہ سے ایسی عظیم الشان قوت پیدا ہوتی ہے جیسی کہ تھوڑے
سے گرم پانی کی بھاپ میں ہو جاتی ہے جس سے ایک معمولی انجن لاکھوں من
سامان کھینچ کر ہزار میل کے فاصلہ پر پہونچا دیتا ہے۔

(۲) اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول یہ انجمن رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز کے

دفتر میں جو صوبہ کے صدر مقام میں ہوتا ہے درج رجسٹر کرائی جاتی ہے۔ اور رجسٹری ہو جانے پر اُسے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ضلع کے کواپریٹو بنک کے حصے خرید کر اس سے قرضہ لے سکے۔ کواپریٹو بنک کے ایک حصہ کی قیمت بالعموم ایک سو روپیہ ہوتی ہے اور یہ ایک سو روپیہ پانچ روپیہ ششماہی کے حساب سے دس سال میں ادا کیا جاتا ہے اس طریقہ پر کاشتکاروں یا کاریگروں کی چھوٹی انجمن ضلع انجمن سے اگر بارہ آنے سیکڑہ پر قرض لے اور اپنے ممبروں کو ایک روپیہ سیکڑہ پر قرض دے تو اس چھوٹی انجمن کو چار آنے سیکڑہ منافعہ ہوتا ہے اور پھر یہ منافعہ بھی انجام کار اُسی کے ممبروں میں تقسیم ہو کر اُن کے پاس پہونچ جاتا ہے۔

(۳) انجمن کی رجسٹری ہو جانے کی وجہ سے اُس کا اعتبار قائم ہو جاتا ہے اور گانوں یا محلہ کے لوگ اس میں اپنی امانتیں رکھتے ہیں جن پر انھیں سود ملتا ہے۔ اس سے دوہرا نفع ہوتا ہے۔ اوّل یہ کہ لوگوں کا بیکار پڑا ہوا روپیہ انجمن میں پہونچکر غریب آدمیوں کے کاموں میں لگتا ہے جس سے دیہاتیوں کو نفع ہوتا ہے۔ اور اس نفع کو دیکھ کر گانوں کے مسرف لوگ کفایت شعار بن جاتے ہیں۔ اور تھوڑا تھوڑا جمع کر کے سوسائٹی کے پاس امانتاً رکھتے ہیں اس زمانہ میں ہندوستان میں سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ جس شخص کے پاس کچھ روپیہ ہوتا ہے تو اگر گھر میں رکھا جائے یا اس کا زیور بنوایا جائے تو چوری اور ڈاکہ کا اندیشہ لگا رہتا ہے یا فضول خرچی کے کاموں میں صرف ہو جاتا ہے بس گانوں کے لوگوں کو کفایت شعار بنانے کے لیئے اس سے بڑھ کر کوئی تدبیر

نہیں کہ وہاں کوآپریٹو سوسائٹی قایم کر دی جائے جس کے پاس امانت میں روپیہ رکھا جاسکے اور اُس امانت پر منافع یا سود ملے۔

غرض کہ اس طرح سوسائٹی یا انجمن کی آمدنی کے چار طریقے ہو جاتے ہیں جن کی تفصیل یہ ہو۔

(الف) ممبروں کے حصوں کی قسطوں کا روپیہ۔

(ب) ضلع کے بینک سے جو روپیہ قرض لیا جائے۔

(ج) لوگوں کی امانتوں کا روپیہ۔

(د) ممبروں کو جو روپیہ قرض پر دیا جائے اُس کا سود یا منافع۔ ان طریقوں سے انجمن کی آمدنی دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی جاتی ہو گاؤں والوں کی ضرورتیں پوری ہوتی رہتی ہیں اور انھیں مہاجن کے پاس نہیں جانا پڑتا ہو۔

(۴) انجمنہائے امداد باہمی میں بالعموم غیر محدود ذمہ داری ہوتی ہو جس سے یہ مراد ہو کہ جملہ ممبران مشترکاً اور منفرداً ہر قرضہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس غیر محدود ذمہ داری کی وجہ سے انجمن کو ضلع کی سوسائٹی سے کم سود پر قرضہ ملتا ہو۔ اور ممبروں کو جب قرضہ دیا جاتا ہو تب بھی اُن میں ضامن دیئے جاتے ہیں اور کل انجمن کی بھی ذمہ داری ہوتی ہو۔ اس طریقہ میں بڑا نفع یہ ہو کہ ممبروں کو قرض دیتے وقت یہ اطمینان کر لیا جاتا ہو کہ جو روپیہ وہ لیتے ہیں وہ صرف نفع آور کاموں میں لگایا جائے گا اور اسراف اور عیش پرستی اور بربادکن رسموں میں نہیں اُڑا دیا جائے گا۔ جو

لوگ مہاجن سے روپیہ لیکر آتے ہیں اُنھیں بالکل آزادی ہوتی ہے کہ جس طرح چاہیں اپنے روپیہ کو اُڑا دیں مگر انجمنہائے امداد باہمی سے جو روپیہ قرض لیا جاتا ہے اُس کی نگرانی ممبران انجمن پوری طرح کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام گاؤں رفتہ رفتہ فضول خرچیوں سے بچنے اور کفایت شعاری اختیار کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

(۵) ان انجمنوں کا قاعدہ یہ ہے کہ دس سال تک اُن کا منافعہ تقسیم نہیں ہوتا بلکہ جمع ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ دس بارہ سال میں انجمن کا کل قرضہ جو ڈسٹرکٹ بینک سے لیا گیا ہو ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ممبران کو بھی چونکہ کم شرح سود پر قرضہ ملتا ہے اور وہ مندرجہ بالا طریقوں کی وجہ سے کفایت شعاری اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو وہ بھی مہاجنوں کے گرانبار قرضے سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اور اُن کی حالت درست ہو جاتی ہے۔

(۶) سوسائٹی قائم ہونے کے دس سال بعد جو منافعہ ہوتا ہے اُسے حسب ذیل طریقوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔

(الف) ایک چہارم سرمایہ محفوظ کے طور پر رکھا جاتا ہے۔

(ب) باقی ماندہ تین چہارم میں سے دسواں حصہ خیراتی کاموں میں صرف کیا جاتا ہے جیسے بچوں کی تعلیم، یتیموں کی پرورش وغیرہ۔

(ج) اور جو ممبر اپنے خریدے ہوئے حصوں کی قسطیں پوری ادا کر چکتے ہیں اُن کے حصوں پر انھیں منافعہ یا سود دیا جاتا ہے جو دس فی صدی سے زیادہ نہیں ہوتا۔

(۷) انجمنہائے امداد باہمی کی کامیابی میں بڑا حصہ اُن مراعات کا ہے جو گورنمنٹ نے اُن کے لیئے کی ہیں مثلاً

(الف) یہ انجمنیں انکم ٹیکس کی ادائیگی سے معاف ہیں۔

(ب) جو ممبر قرضہ کی دستاویزیں یا رقعے انجمن کے نام لکھیں وہ اشٹامپ سے معاف ہیں۔

(ج) فیس رجسٹری معاف ہے۔

(د) کمپنی ایکٹ کی شرائط ان پر عائد نہیں ہوتیں۔

(ہ) ان انجمنوں سے روپیہ لے کر جو فصل یا سامان تیار کیا جاوے اُن سے روپیہ وصول کرنے کا حق فایق ان انجمنوں کو ہوتا ہے۔

(و) انجمنوں کے حصوں کا روپیہ عدالت سے قرق نہیں ہو سکتا۔

(ز) حسابات کی جانچ گورنمنٹ کی طرف سے ہوتی ہے۔

(ح) ممبروں کے ذمہ جو مختلف قسم کے مطالبہ جات ہوتے ہیں وہ اگر خوشی سے نہ دیں تو بغیر مقدمہ بازی اور خرچہ کی زیر باری کے عدالت کے ذریعہ سے بسہولت وصول ہو جاتے ہیں۔

جون ۱۹۲۶ء

(مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

(محمد احمد الدین پرنٹر)